غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کردیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہوجائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولو گے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ اگرچہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس لیے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفرِ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کردیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے میل تال اور محبتوں کے

بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان
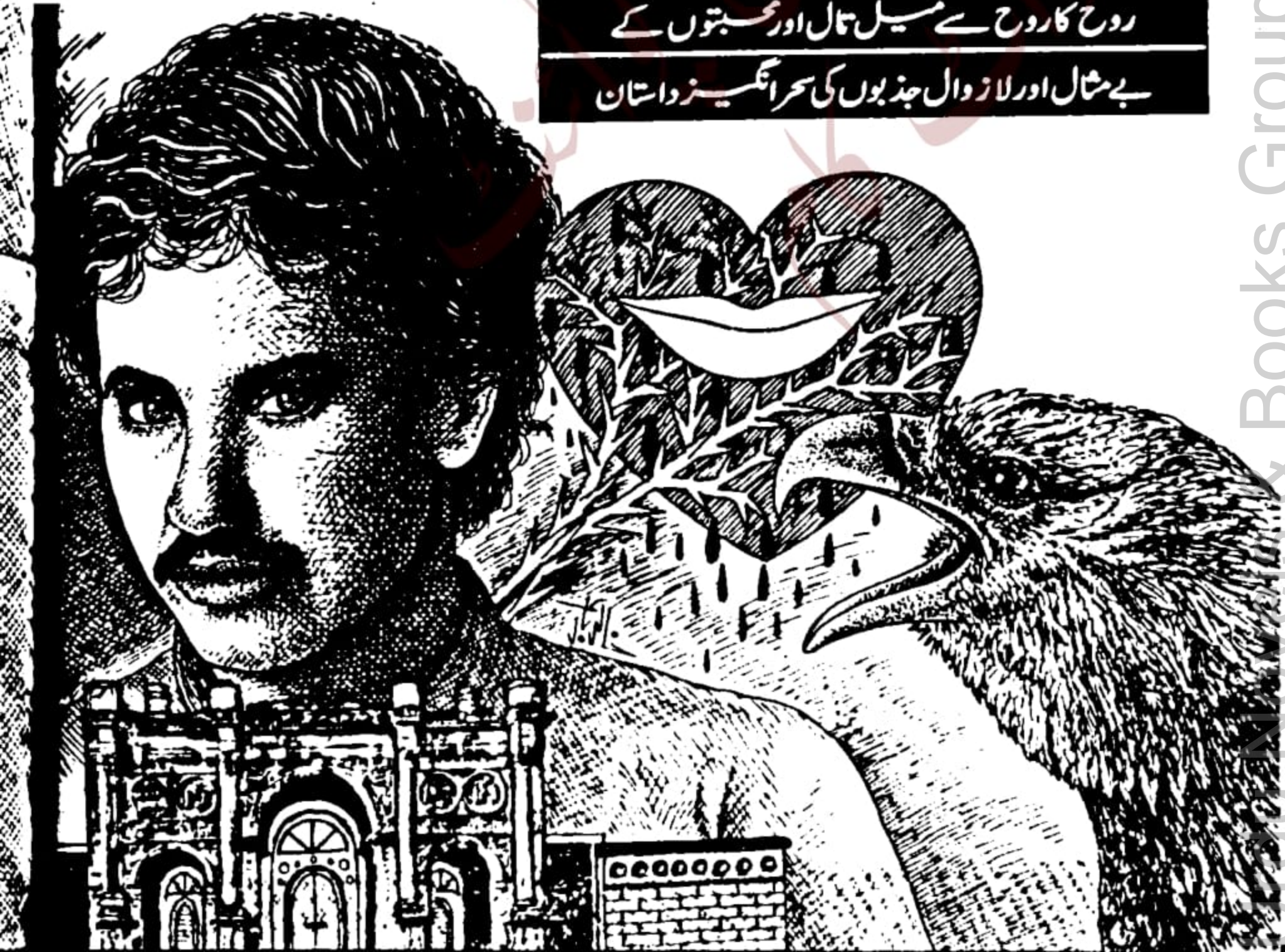
سہ پہر ختم ہو رہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ سہ پہر اور شام کے اس درمیانی وقفے میں ایک اداس ہوا چلتی تھی جو اس ریگستانی علاقے میں ریت کے ذرّوں کو یہاں سے وہاں لے جاتی تھی۔ اس اداس ہوا میں ایک سناٹا سا تھا جیسے...... دور بیابانوں میں بانسری کے لطیف سُروں پر کوئی اجنبی سا غم ہلکورے لے رہا ہو، سناٹے کا اَن دیکھا پھیلاؤ اسے اچھا لگتا تھا۔ سناٹے کی اَن سنی تانیں اس کے دل کے تار چھیڑتیں، اسے گدگداتی تھیں۔ تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ ماں جیسی شفیق ہستی سے وہ آشنا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے جانا ہی نہ تھا کہ باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے؟ بہن بھائی، رشتے دار، یہ سب کچھ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ جیسے تنہا آسمانوں سے پھینکا گیا تھا۔ شاید وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھا جو غلطی سے اس کرۂ ارض پر اتر آیا تھا۔

وہ ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتا تو بچپن کی جو پہلی یاد اس کے ذہن میں آتی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ ایک کھیت کے کنارے کھالے کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے اور تیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک احساس اسے بتاتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ پاؤں نہ چلائے تو وہ پانی کے اندر چلا جائے گا اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو برسوں بیت چکے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوئی اور سڈول تھی۔ اس کے بازو معمول سے لمبے اور مسل مضبوط تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جیسے ایک بے قراری سی کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ وہی بے قراری جو بندے کو کسی جگہ ٹکنے نہیں دیتی۔ وہ بھی کہاں ٹکتا تھا۔ لاہور میں تھا تو اس نے دو تین ٹھکانے بدلے تھے۔ پھر وہ پنڈی چلا گیا۔ پنڈی میں ایک بندے سے اس کا جھگڑا ہوا۔ جھگڑے نے طول پکڑا تو وہ وہاں سے بھی نکل آیا۔ کراچی کے ساحل نے چار سال تک اس کے پاؤں پکڑے رکھے مگر اس کی بے چین طبع نے اسے وہاں بھی مستقل ڈیرا نہیں ڈالنے دیا۔

ہاں، تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ اجنبی سناٹے سے اس کا پہلا عشق تھا۔ تنہائیوں، سناٹوں اور اجنبی ویرانوں کی بہترین جگہ ریگستان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور اب وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ ماہ سے وہ چولستان میں تھا...... ترنڈا کا ایک قریبی گاؤں منڈ بھیرو اس کا مسکن تھا۔ پنڈی کے ایک پرانے دوست نے کراچی میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ منڈ بھیرو لے آیا تھا...... اور اب پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے وہ اس کے ساتھ اس کے تباہ شدہ گھر کی چھت تعمیر کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔

ہاں تو سہ پہر ختم ہو رہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ وہ ایک ریتیلے ٹیلے پر نیم دراز دور افتادہ سناٹوں سے اٹھنے والی بانسری کی غم انگیز آواز سن رہا تھا۔ اس نے نشیب میں دیکھا جہاں پانی ذخیرہ کرنے والے وسیع تالاب نما جوہڑ کا پانی سورج کی روشنی میں لشکارے مار رہا تھا۔ اس نے ایک جیپ دیکھی جو دھول اڑاتی، تیزی سے تالاب کے پاس سے گزر رہی تھی پھر اچانک کچھ عجیب ہوا۔ تیز رفتار جیپ نے ایک دو ہچکولے کھائے۔ بری طرح لہرائی پھر ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔ جیپ نے باقاعدہ قلابازی کھائی اور ایک زبردست چھپاکے کے ساتھ پانی میں جا گری۔ وہ آڑی گری تھی، اس کے دونوں عقبی پہیے نظر آ رہے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں پہیے بھی اوجھل ہو گئے اور صرف پچھلا بمپر اور اسکرین وغیرہ ہی پانی سے باہر رہ گئے۔

آس پاس کوئی نہیں تھا بلکہ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آتا تھا۔ دلاور نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس نے جیپ الٹتے وقت دور سے مدھم سی نسوانی چیخ بھی سنی تھی۔ وہ اٹھا اور کسی چھلاوے کی طرح بے ساختہ ڈھلوان پر دوڑتا چلا گیا۔ اس کے چوڑے مضبوط پاؤں جیسے ریت پر بھنور سے بنا رہے تھے۔ تالاب تک تقریباً 100 میٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے آناً فاناً طے کیا اور ایک جست لیتا ہوا پانی میں کود گیا۔ وہ اس تالاب کی گہرائی سے واقف تھا۔ آڑی ترچھی جیپ اب مکمل طور پر پانی میں ڈوب چکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہاتھ پاؤں مار کر رہ جاتا لیکن وہ لہروں کا شناور تھا، پانی میں اترنا اور اس سے لڑنا جانتا تھا۔ اس نے سانس باہر نکالی اور دس بارہ فٹ نیچے چلا گیا۔ ایک لڑکی کے بال اس کے ہاتھ میں آئے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا اور کنارے پر ڈال دیا۔ لڑکی چند سیکنڈ سے زیادہ پانی میں نہیں رہی تھی مگر مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی کوئی چوٹ تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور فیشن ایبل لباس میں تھی۔ لگتا تھا کہ شہر کی رہنے والی ہے۔

شاید دلاور ابھی کچھ دیر مزید اسے دیکھتا رہتا مگر وہ جانتا تھا کہ ابھی کم از کم ایک فرد اور پانی کے اندر ہے۔ اس نے دوبارہ پانی میں جست کی اور غوطہ لگا کر جیپ تک پہنچ گیا۔

دروازہ کھل جانے سے لڑکی تو خود بخود پانی میں گر گئی تھی مگر اس کا ساتھی ابھی تک جیپ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس

نے سیفٹی بیلٹ بھی لگا رکھی تھی۔ دلاور نے دیکھا کہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی ہے اور آنکھیں بند ہیں، وہ شدید خطرے میں تھا۔ دلاور نے اس کی سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیلٹ بری طرح بکل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بکل کو توڑ کر یا بیلٹ کو کاٹ کر ہی اس شخص کو آزاد کرایا جاسکتا تھا۔ یہ لمحے اس شخص کی زندگی کے لیے بڑی قیمتی تھے۔ دلاور کا سانس سینے میں گھٹنا شروع ہوگیا۔ اگر وہ تازہ سانس لینے کے لیے سطح آب پر چلا جاتا تو پھر شاید دیر ہوجاتی۔ وہ پانی میں ہی رہا اور دیوانہ وار سیفٹی بیلٹ سے الجھتا رہا۔ آخر معجزہ ہوگیا۔ دلاور کے زور لگانے سے بکل کا کچھ ٹوٹ گیا اور بے ہوش شخص اس جان لیوا بندش سے آزاد ہوگیا۔ دلاور نے اسے کھینچ کر جیپ سے نکالنے کی کوشش کی۔ جیپ کے الٹنے سے اسٹیئرنگ کا اینگل ایسا ہوگیا تھا کہ وہ شخص بہ آسانی ڈرائیونگ سیٹ سے جدا نہیں ہو پارہا تھا۔ دلاور نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی آسان کی اور اس شخص کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سطح آب پر لے آیا۔ قریباً چھ منٹ بعد، بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی اور اس کے جسم وجاں میں پھر سے زندگی دوڑ گئی۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی، دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ بس درخت اور ریتیلی زمین کے نشیب وفراز تھے۔ وہ بے ہوش نوجوان کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور لٹا دیا۔ تب اس کی نگاہ دوبارہ خوبرو لڑکی پر پڑی۔ اس کی قمیص بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور بھیگی لٹیں بل کھا کر ایک رخسار کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ سورج کی ترچھی روشنی اس چہرے کو کچھ یوں منور کررہی تھی کہ وہ دیکھتا ہی چلا گیا۔ کچھ لمحے بڑے انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔ ان میں صدیوں کی وسعت ہوتی ہے اور کوئی ایسی توانائی ہوتی ہے جو پلک جھپکتے میں پوری زندگی کا احاطہ کرلیتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی ساعتیں تھیں۔ دلاور سب کچھ بھول بھال کر اس چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ کوئی نادیدہ کشش تھی جو اسے اس چہرے کے بالکل قریب لے گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ سانسوں کی آہٹ تک محسوس کرنے لگا۔ وہ عجب سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ بے ساختہ آگے کو جھکا تھا۔ پھر کیا ہوا، کیسے ہوا، سب کچھ ایک سحر انگیز دھندلکے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا جو شاید دنیا میں سب سے حسین ترین تھے۔ یا پھر وہ سب سے حسین ترین نہیں تھے لیکن اس جادوئی ماحول نے، سورج کی ان ترچھی کرنوں نے اور رہی کی مست کردینے والی ہوا نے انہیں حسین ترین بنادیا تھا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا، اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ مدہوشی کی سی کیفیت تھی لیکن اس کے اندر سے ایک طرح کی ملامت کا احساس بھی نمودار ہورہا تھا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا، پھر اس سے یہ کیونکر ہوا؟

اچانک اسے خیال آیا کہ چند فٹ کے فاصلے پر وہ نوجوان بھی اوندھا پڑا ہے جسے اس نے موت کے منہ سے نکالا ہے اور جس کو ابتدائی طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ وہ پلٹا اور اس نوجوان پر جھک گیا۔ اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں یقیناً پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی کمر پر دباؤ ڈال کر اس کے اندر سے پانی نکالنے لگا۔ کافی پانی نکلا۔ تب اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بہت مدھم تھی، جیسے کسی اتھاہ کنویں میں پانی ہلکورے لے رہا ہو۔ وہ اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے ہوش نوجوان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا، پھر اس نے دو الٹیاں کیں...... وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دلاور کی مسلسل کوشش بے ثمر نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں خوبرو لڑکی بھی ہوش میں آچکی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی پھر اس کی نگاہ بے ہوش نوجوان پر پڑی۔

''شاہ زمان...... شاہ زمان!'' وہ چلاتی ہوئی اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے بھیگے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔

دلاور نے حوصلہ کر کے لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''میڈم! آپ حوصلہ رکھیں۔ یہ جلد ہوش میں آجائیں گے ...... یہ دیکھیں ...... ان کی پلکوں میں حرکت ہورہی ہے۔''

''اوہ گاڈ ...... یہ کیا ہوگیا ہمارے ساتھ۔'' لڑکی کبھی اپنے ساتھی کی طرف اور کبھی اس تالاب کی طرف دیکھتی تھی جہاں ان کی جیپ پانی کے اندر گئی تھی۔

کچھ دیر بعد نوجوان کے حواس بھی بحال ہونے لگے۔ وہ بجھی بجھی آنکھوں سے تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کچھ چوٹیں آئی تھیں لیکن چہرے پر کوئی ایسا خاص نشان نہیں تھا۔ دلاور کو لڑکی کا نام سویرا معلوم ہوا۔ اس نے جدید تراش کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کو جو واحد چوٹ لگی تھی وہ اس کے سر پر تھی۔ کنپٹی کی طرف ایک گومڑ بن گیا تھا جس میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

اسی دوران میں قریبی گوٹھ سے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو بکریاں چرانے والے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ آناً فاناً شاہ زمان اور سویرا کو ایک اونٹ گاڑی پر بٹھا کر گوٹھ میں ایک ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ پاؤں کی شدید چوٹ کی وجہ سے شاہ زمان کو چلنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

گوٹھ کا چودھری ''رحیم سائیں'' شاہ زمان کے بڑے بھائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ فوری طور پر ان کو طبی امداد دی گئی۔ سویرا کو ڈیرے سے تھوڑی دور ایک حویلی کے زنان خانے میں بھجوا دیا گیا۔ سویرا کی ایک کلائی پر گہری خراش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی خراشیں تھیں لیکن شاہ زمان کی حالت پتلی تھی۔ اس کا ایک بازو نہیں مل رہا تھا، جبکہ ٹخنے کے قریب گہرا زخم آیا تھا۔ اس زخم کی وجہ یہ تھی کہ جیپ الٹتے وقت یہ پاؤں بریک پیڈل میں پھنس گیا تھا۔

رحیم سائیں نے فوری طور پر گاؤں کے ماہر کمپاؤنڈر کو بلایا اور اپنے سامنے شاہ زمان کے ٹخنے اور بازو کی ڈریسنگ کروائی۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر دو جیپیں آ کر کھڑی ہوئیں۔ ا[illegible] میں سے دھڑا دھڑ لوگ اترنے لگے۔ وہ سب کے سب [illegible] تھے۔ ان کی قیادت کرنے والا پیر فضل تھا۔ بھاری تن و توش، گہری گندمی رنگت، سفید چھدری ڈاڑھی اور سر پر مخصوص چولستانی پگڑی۔ وہ سیدھا شاہ زمان کے پاس آیا۔ شاہ زمان نیم دراز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ زمان کو اپنے ساتھ لگایا اور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''ذمی رانی تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں چاچا! وہ ٹھیک ہے، بس معمولی چوٹ آئی ہے۔'' وہ نقاہت سے بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں...... تو بہر شیر ہے۔ میں نے جیپ پانی میں سے نکلوالی ہے۔ اپنے بندے ٹارچوں کی روشنی میں گڈی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایک ٹائر میں ہوا نہیں ہے۔ کہیں کوئی فائر شائر تو نہیں لگا؟''

''نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر ہوا کیا ہے؟''

''بس قسمت میں یہ چوٹیں لکھی تھیں۔ اسپیڈ تھوڑی سی تیز تھی۔ ایک کھڈے کی وجہ سے جیپ اچھلی اور کنٹرول سے باہر ہوگئی۔''

''تجھے کتنی دفعہ کہا ہے پترا! گڈی کو گڈی سمجھا کر، ہوا کا گھوڑا نہ سمجھا کر۔'' وہ اپنی بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ قریب کھڑے دلاور پر پڑی۔ دلاور بڑے دھیان سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

''یہ منڈا کون ہے؟'' پیر فضل، دلاور کو بغور دیکھ کر بولا۔

''یہی تو ہے چاچا...... جس نے ہم دونوں کو موت کے منہ سے نکالا ہے۔'' شاہ زمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا...... اور کہاں کے رہنے والے ہو؟'' پیر فضل کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا۔

''دلاور نام ہے جی...... میں منڈ بھیرو...... میں رہتا ہوں۔''

''یہاں کے تو نہیں لگتے۔ کہاں سے آئے ہو؟'' پیر فضل نے پوچھا۔

''میرا دوست مجھے کراچی سے یہاں لایا ہے۔ چند مہینے سے یہاں اس کا مہمان ہوں۔''

اسی دوران میں ڈیرے کا مالک رحیم سائیں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ پیر فضل نے کھڑے ہو کر اس سے معانقہ کیا اور اچھے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

رحیم سائیں نے کہا۔ ''بچوں کی جان بچ گئی ہے، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہیں اور اس خوشی میں سے یہ خوشی بھی نکلی ہے کہ آپ لوگ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ بڑے بخت کی بات ہے۔''

رحیم سائیں اور پیر فضل ساتھ ساتھ بیٹھے۔ ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی میزوں پر کھانا چن دیا گیا۔ پیر فضل کے بے حد انکار کے باوجود انہیں کھانے کی دعوت قبول کرنا پڑی۔ شاہ زمان کی طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں تھی۔ اس نے بس چند لقمے لینے پر اکتفا کیا۔ کھانے کے دوران میں جب دلاور کو علیحدہ سے کھانا دیا جانے لگا تو شاہ زمان نے منع کر دیا اور اسے اپنے برابر میں بٹھا کر کھانا کھلایا۔

شاہ زمان خاموش تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی عجیب نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھتا تھا۔ ان نگاہوں میں احسان مندی کے رنگ لہریں لیتے تھے اور احسان مندی کیوں نہ ہوتی۔ جان بچانے والا تو اللہ ہوتا ہے لیکن جو کچھ دلاور نے کیا تھا، شاید کوئی اور نہ کر سکتا۔ جیپ تو مکمل ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر گہرے غوطے میں گیا تھا اور سخت کوشش کر کے پہلے سویرا اور پھر اسے نکال لایا تھا۔ اگر اس کا سانس ٹوٹ گیا ہوتا تو پھر...... شاید

تالاب سے تین لاشیں ہی نکلتیں۔

پرتکلف کھانے سے فارغ ہو کر پیر فضل نے سگار سلگا لیا اور موبائل فون پر شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کو خیر خیریت کی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ لوگ جیپ کو فی الحال یہیں پر چھوڑ رہے ہیں تاکہ اسے چلنے کے قابل بنایا جاسکے۔ اس کے بعد پیر فضل اور شاہ زمان نے رحیم سائیں کا پھر شکریہ ادا کیا اور سویرا کو بلوانے کا کہا۔

سویرا کا نام سن کر یکبارگی دلاور کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سویرا بڑی سی چادر میں لپٹی لپٹائی باہر برآمدے میں آئی تو پیر فضل نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''جیوندی رہ دھی رانی۔''

سویرا نے سر جھکا کر پیار وصول کیا۔ اسی دوران میں کریم کلر کی پھولدار چادر میں لپٹی ہوئی سرو قد سویرا نے ذرا ترچھی نظر سے دلاور کی طرف دیکھا۔ یہ نظر جیسے کسی ورمے کی طرح دلاور کے سینے سے آر پار ہوگئی۔ وہ بس ''ایک'' نگاہ ہی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ جتنی دیر وہاں کھڑے رہے، سویرا بالکل لاتعلق ہی رہی۔

وقت رخصت رحیم سائیں نے مٹھائی کے دو بڑے بڑے تھال پیر فضل کو پیش کیے اور صدقے کے طور پر ایک کالے بکرے کی قربانی ان کے سامنے کی۔

شاہ زمان کو کرسی پر بٹھا کر دو کارندوں نے اٹھالیا۔ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے شاہ زمان نے ایک کارندے سے کہا۔ ''دیکھو، دلاور کہاں ہے؟''

دلاور جیپ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ کارندہ دلاور کو بلا لایا۔

شاہ زمان، دلاور کو خاموشی سے دیکھتا رہا...... پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ میٹھے لہجے میں بولا۔ ''دلاور! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ دو چار دن حویلی میں ہمارے مہمان رہو۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر ہم سب کو بہت اچھا لگے گا۔''

دلاور کے کانوں میں جیسے شادیانے سے بج اٹھے۔

ایک بار پھر وہی چہرہ اور وہی ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ وہ کیا لمحے تھے؟ وہ کیا جادو تھا؟ وہ سب کچھ کیوں ہوگیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کوئی مقناطیس سا تھا جو اپنی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا...... اور اس کی تمنا کے عین مطابق اسے چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس نے پہلے تو تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، پھر اپنے احسان مند میزبانوں کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔

منڈ بھیرو کے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ ''چوڈیرو'' نامی اس گاؤں کی خاص بات وہ خوبصورت نخلستان تھا جو ریگستانی پٹی کے ساتھ ساتھ چودہ پندرہ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ وہاں مال مویشی چرتے تھے۔ فربہ بھینسیں آزادانہ گھومتی تھیں اور خاص قسم کی بھیڑیں تھیں جن کے منہ سفید اجلے اور جسم پر خوبصورت چتکبرے دھبے سے تھے۔ قریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ بڑے سائیں کی قریباً پانچ ایکڑ پر پھیلی ہوئی حویلی مغلیہ دور کے کسی قلعے کی یاد دلاتی تھی۔ بلند فصیلیں، تین فٹ چوڑی دیواریں، اصطبل، نایاب گھوڑوں کے جتھے، دو کوہانی سفید اونٹ، شکاری کتے، چھیل چھبیلی ملازماؤں کی چھل پھل، دست بستہ ملازموں اور ہرکاروں کی فوج...... دلاور نے یہ شاندار حویلی دیکھی اور بس دیکھتا رہ گیا۔

درحقیقت دلاور کے پاؤں سے بگولے بندھے ہوئے تھے۔ وہ آزاد طبع رکھتا تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا شاید اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی بندھن میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شتر بے مہار تھا۔ اسی لیے اس نے پنڈی چھوڑا، اسی لیے شہر لاہور کے دلکش بھنور، جو بہت سوں کو جکڑ کر مفلوج کر دیتے ہیں، اس کا راستہ نہ روک سکے۔ اسی لیے شاید وہ کراچی کے ساحل کی گیلی ریت کو پاؤں سے دھکیلتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اور اب وہ یہاں اس حویلی میں تھا۔ منڈ بھیرو سے چلتے وقت دلاور نے اپنے دوست ملتانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ملتانی بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ پیر فضل تو حویلی میں داخل ہوتے ہی اپنے دو گن مین لے کر حویلی کے جنوب کی طرف چلا گیا۔ شاہ زمان اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوتے ہی سرتاپا ''بڑا سائیں'' نظر آنے لگا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے بہت سی خواتین کھڑی تھیں۔ اس کی کرسی جب برآمدے میں رکھی گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ زمان کا رنگ گورا، بال گھنگرالے، بھویں موٹی اور آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ چوڑے جبڑے اس کی سخت مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا خواتین کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر جس عورت نے اس کا ماتھا چوما، وہ ادھیڑ عمر آپا صوفیہ تھی۔ سب انہیں بڑی آپا کہتے تھے۔ وہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کی سب سے بڑی بیوی تھیں۔ وہ

دلاور کو ایک باوقار اور نہایت زیرک عورت لگیں۔ ایک ایسی خاتون جس نے بہت دکھ سہہ کر اور زمانے کا بہت سا ''سردگرم'' دیکھ کر اب اپنی زندگی کے لیے مناسب راستے ڈھونڈ لیے ہوں۔

انہوں نے دراز قد شاہ زمان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ''آپا صدقے، تو ٹھیک تو ہے نا؟''

شاہ زمان بولا۔ ''بڑی آپا! خدا کا شکر ہے، اس نے نئی زندگی دی ہے ہم دونوں کو۔''

بڑی آپا نے شاہ زمان کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد سویرا کو گلے سے لگالیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ دلاور فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ جتنی بار بھی سویرا پر پڑی تھی، بس وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں حویلی کی دیگر خواتین آگے بڑھ کر سویرا اور شاہ زمان کی بلائیں لینے لگیں۔ دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ سویرا اور شاہ زمان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

اسی دوران میں شاہ زمان نے دلاور کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی آپا کو بتایا کہ یہی وہ بندہ ہے جس کے وسیلے سے آج ان دونوں کی جان بچ پائی ہے۔ بڑی آپا نے دلاور کو سرتاپا دیکھا پھر بڑے شائستہ انداز میں اس کے لیے شکریے اور تعریف کے الفاظ ادا کیے۔ بڑی آپا نے دلاور کی طرف دیکھ کر شاہ زمان کے کان میں ایک دو سرگوشیاں بھی کیں۔

دلاور اور ملتانی کو بڑی محبت کے ساتھ مہمان خانے کے ایک شاندار کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی میزبانی میں کسی طرح کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ ملتانی خوش خوراک تھا۔ موجودہ صورت حال اس کے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ ملتانی کو اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کھانے والی اشیا کے اشتہار وہ خاص رغبت سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ پانچ چھ جماعتیں ہی پڑھا تھا۔ اس کے برعکس دلاور نے کھینچ تان کر ایف اے پاس کر رکھا تھا۔ وہ صرف کھانے کے اشتہاروں کے لیے اخبار نہیں دیکھتا تھا بلکہ اسے پڑھتا بھی تھا۔

اگلے روز ملتانی حویلی میں تھوڑا سا گھوما پھرا۔ اس نے ملازمین سے باتیں کیں اور تھوڑی بہت سن گن بھی لی۔ اسے پتا چلا کہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان نے چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی بیوی آپا صوفیہ اور سب سے چھوٹی جو حال ہی میں بیاہی گئی ہے، شاہدہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شاہ زمان حالانکہ چھوٹا ہے پھر بھی اسے بڑا سائیں کہا جاتا ہے اور وہ اس لیے کہ وہ بڑے بھائی سے زیادہ قابل اور سمجھ دار ہے...... اور چوڈیرو کے لوگ اس کی بے پایاں صلاحیتوں کی وجہ سے اسے ہی بڑا سمجھتے ہیں، جبکہ اصل بڑا یعنی شاہ فرمان زیادہ تر نشے میں غرق رہتا ہے۔ شاہ زمان کے بارے میں ملتانی کو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے لیکن جلد ہی اس کی شادی رچنے والی ہے۔

شام کے وقت دلاور نے کمرے کی کھڑکی میں سے باغیچے کی طرف دیکھا۔ وہاں شاہ زمان کھڑا تھا۔ زخمی پاؤں کی وجہ سے اس نے ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھام رکھی تھی۔ اس کے قریب وہی ماہ رخ، پری پیکر تھی جس نے پلک جھپکتے ہی دلاور کے دل کی دنیا زیر وزبر کر ڈالی تھی...... ہاں وہ سویرا تھی۔ لمبے بال کمر تک جارہے تھے، ریشمی اوڑھنی ان بے بہا بالوں کو سنبھالنے میں ناکام تھی۔ وہ شاہ زمان سے بات کررہی تھی۔ شاہ زمان مونچھوں پر انگلی پھیر رہا تھا اور بڑی پُرتپش نظروں سے سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمانے والے انداز میں مسکرائی اور پھر رخ پھیر کر سفید گلابوں کی کیاری کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ایک خاص دلکشی تھی اس کے نقوش میں۔

دلاور کے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ تو کیا سویرا ہی وہ لڑکی تھی جس سے شاہ زمان کی شادی کی تیاری ہورہی تھی؟ وہ بے ساختہ سویرا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ آس پاس کا سارا منظر جیسے فیڈ آؤٹ ہوگیا۔ اس کے سامنے بس وہ دلکش مرمریں مورتی رہ گئی جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مجموعی خوبصورتی کی طرح لاجواب تھی۔ اس نے سوچا...... بے پناہ خوبصورت لوگوں کی ہنسی بھی ایسی ہی لاجواب ہونی چاہیے۔ اچانک اس نے خود کو اس ''ٹرانس'' میں سے نکالا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہورہا تھا؟ وہ ایسا تو نہیں تھا؟ وہ تو کسی کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ پھر یہ کیسا منہ زور جذبہ تھا جو اسے اپنے ساتھ بہائے چلا جارہا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی جو اس کے وجود کی طنابیں کھینچ رہی تھی؟

شاید کچھ معاملات انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتے۔ کچھ بے پناہ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو بے بس کردیتے ہیں۔ کچھ احساسات، جن کی ڈوریاں دستِ غیب سے حرکت میں آتی ہیں۔

سویرا آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھی اور دلاور زندگی کے صحرا میں اڑنے والا ریت کا ایک ذرہ۔ وہ چوڈیرو کی امیرزادی تھی اور وہ نگر نگر گھومنے والا بنجارا جسے اپنی ابتدا، اپنے ماضی کا بھی علم نہیں تھا۔ انجانے میں ایک جذبہ تھا جو

دلاور کے دل میں نمو پا چکا تھا۔ انسان کے اندر کوئی بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا ادراک سب سے پہلے خود اسی کو ہوتا ہے۔ دلاور سمجھ چکا تھا، کوئی بہت بڑی تبدیلی احساسات میں آچکی ہے۔

یہ دوسری رات کی بات ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بیڈ روم بہت شان دار تھا۔ ملتانی نے مرغ پلاؤ اور خالص دودھ کی کھیر بہت سیر ہو کر کھائی تھی۔ اب وہ سوسیر کا ریچھ اوندھے منہ پڑا خراٹے لے رہا تھا مگر دلاور کی آنکھوں سے نیند روٹھ چکی تھی۔ وہ جونہی آنکھیں بند کرتا، وہ گلابی ہونٹ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی یہی ہوا تھا، وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سنگِ مرمر کی تپائی سے جگ اٹھایا، پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی بار میں پی گیا۔ اسے گرمی محسوس ہونے لگی، دل گھبرانے لگا۔ وہ بیڈ سے اترا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ رات کا شاید پچھلا پہر تھا۔ مشرق کی طرف سے ہلکی صحرائی ہوا چل رہی تھی۔ وہ صحن میں آیا۔ یہاں زنانے اور مردانے حصے کے درمیانی احاطے میں ایک طرف دو جھولے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے کافی وسیع گراسی لان تھا جہاں انواع و اقسام کے پھول اور پھل دار پودے تھے جن میں سے زیادہ تر جنوبی پنجاب سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ لان کے اختتام پر اینٹوں کی سولنگ والا ایک اور احاطہ تھا جہاں جیپیں اور دیگر گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے ملازمین کے رہائشی کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی بائیں جانب زنانے حصے کی دو منزلہ عمارت تھی جو درختوں کے پیش منظر میں آدھی چھپی، آدھی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے کچھ کمروں میں مدھم روشنی تھی جو بیش قیمت پردوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی کسی کمرے میں سویرا سو رہی ہوگی۔ وہ بے مثل حسن سوتے میں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا حسن کے سونے کا انداز بھی حسین ہوتا ہے؟ ایک بار پھر وہی دو لب...... تھوڑے سے نم...... تھوڑے سے گرم اس کے تصور میں آن دھمکے۔ اس نے سوچا اگر اس وقت تالاب کے کنارے، کوئی اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

اس نے جھرجھری سی لی اور خیالات کے نرغے سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

چہل قدمی کرتا ہوا وہ ملازمین کے کوارٹرز سے آگے چلا گیا۔ وہاں کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ وہ ابھی واپس مڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے درختوں سے آگے کچھ کھٹ پٹ سی سنائی دی۔ وہ چونک گیا اور دبے پاؤں چل کر سرعت سے ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ وہ چند ملازمین تھے جو ڈھائی تین فٹ مربع کے تین چار چوبی ڈبے اٹھائے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ تجسس کے سبب اس کی تمام خوابیدہ حسیات جاگ اٹھیں۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں سے ملازمین کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی ہمت کی اور درمیانی فاصلہ کچھ اور کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے منظر تھوڑا اور واضح ہو گیا۔ وہ پانچ افراد تھے جو لکڑی کے چوکور ڈبوں کو بڑی احتیاط سے اٹھائے ایک تاریک دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ڈبوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔

ان ڈبوں میں کیا تھا؟ رات کے اس پہر اتنی رازداری سے یہ کام کیوں کیا جا رہا تھا؟ کئی سوال دلاور کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ ملازمین تاریک دروازے میں داخل ہو کر اوجھل ہو چکے تھے۔ باہر سناٹے میں بس مدھم صحرائی ہوا کی سرگوشی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا تاریک دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے سے آگے سیڑھیاں کسی تہ خانے میں اتر رہی تھیں۔ ملازمین سیڑھیوں کے نچلے سرے تک پہنچ چکے تھے۔ دلاور دروازے کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے عقب سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہیں کھڑا رہے یا پلٹ جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچتا، نیچے کسی ملازم کے ہاتھوں سے ڈبا چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ پھر اچانک کوئی چیز پھڑپھڑانے لگی۔ پورے تہ خانے میں جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ ملازمین میں افراتفری پھیل گئی۔ وہ ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ننگی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

پھر ایک ملازم تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر آیا۔ دلاور نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کر دیتا تو اس شخص کی نظر میں آ جاتا۔ اس شخص نے بڑی عجلت میں تہ خانے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔

دلاور دیوار سے پشت لگائے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ یہ ابھی، اس نے کیا دیکھا تھا۔ لکڑی کے چوکور ڈبے میں کیا تھا جو نکلا تھا اور پھڑپھڑانے لگا تھا؟

دور کہیں مغرب کی جانب کسی ریگستانی گلی کی چھوٹی سی مسجد سے اذانِ فجر کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ اس نے

اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو ملتانی جاگ چکا تھا اور اس کی غیر حاضری پر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا...... دلاور کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔''

ملتانی بولا۔ ''کھانا تو میں ڈٹ کر کھاتا ہوں اور اینٹھن تمہارے پیٹ میں ہونے لگتی ہے۔''

''یہی تو سچی دوستی کا ثبوت ہے۔'' دلاور نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

ملتانی تو تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گیا مگر دلاور جاگتا رہا۔ اس کا ذہن بار بار تہ خانے والے واقعے کی طرف جا رہا تھا۔

صبح دلاور کے لیے بے حد خوبصورت تھی۔ بیڈ روم سے نکل کر جب وہ نشست گاہ میں آیا تو سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر ناشتا لیے بیٹھی تھی۔ چہرہ پرسوں رات سے بھی زیادہ پیارا اور روشن دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دودھ اور میدے سے نہا کر نکلی ہے۔ ملازمہ جھک کر ناشتے کی چیزیں ترتیب سے میز پر رکھ رہی تھی۔ سویرا تمکنت سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اب تک کے مشاہدے میں دلاور نے نوٹ کیا تھا کہ سویرا نہ صرف پڑھی لکھی اور روشن خیالات والی لڑکی ہے بلکہ کافی حد تک صاف گو اور بے تکلف بھی ہے۔ بے شک حویلی کا ماحول جاگیردارانہ رنگ ڈھنگ کا تھا مگر سویرا اپنے حلیے سے لے کر اپنی بول چال تک بالکل ماڈرن لگتی تھی۔

''ہیلو مسٹر دلاور۔'' وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے؟''

دلاور کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہ مؤدب انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''سویرا بی بی! آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکریہ لیکن...... آج رات میں...... ایک پل کے لیے بھی سو نہیں سکا۔''

وہ تھوڑی پریشان ہو گئی۔ ''کیوں؟ کوئی مسئلہ تھا؟''

وہ کہنا چاہتا تھا...... سب سے بڑا مسئلہ تو آپ ہیں سویرا بی بی لیکن کہہ نہیں سکا۔ ''اصل میں مجھے نئی جگہ نیند نہیں آتی۔'' اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو تمہیں بڑی مشکل پیش آتی ہو گی...... میرا مطلب ہے، تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تم شہر شہر اور بستی بستی گھومتے ہو۔''

وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ اسی دوران میں سویرا نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بڑی احتیاط سے کپ سویرا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... پہلے دو چار دن مشکل پیش آتی ہے، پھر میں عادی ہو جاتا ہوں۔''

سویرا کی تیز نگاہیں دلاور کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ نروس سا ہونے لگا۔ اپنی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے اس نے بیڈ روم کی طرف رخ کر کے ملتانی کو آواز دی۔ اس دوران میں سویرا نے ایک جیم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں کھنکنا اٹھیں۔ وہ ایک سلائس پر جیم لگاتے ہوئے بولی۔

''دلاور! تم کچھ پریشان نظر آتے ہو؟''

''نن...... نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

سویرا نے ملازمہ سے کہا کہ وہ بیڈ روم سے ملتانی کو بلا لائے۔ ملازمہ جونہی کمرے سے نکلی، سویرا تھوڑا آگے ہوئی اور اس نے نہایت بے تکلفی اور اعتماد سے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''تھینک یو ویری مچ دلاور! تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بچانے والا تو بیشک اوپر بیٹھا ہے مگر وہ بچانے کا کام اپنے ہی کسی بندے کو سونپتا ہے نا۔''

دلاور کا سارا وجود جیسے اس نرم و نازک ہاتھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا، گھڑیاں ختم ہو جائیں، وقت رک جائے...... اور وہ اسی مہرباں بوجھ تلے پڑا رہے۔ اس نے سویرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ ''میں کسی قابل نہیں ہوں سویرا بی بی! بس اوپر والے نے مجھ سے یہ کام لینا تھا، لے لیا......''

سویرا کی کنپٹی پر ابھی تک ایک چھوٹی سی بینڈ ایج موجود تھی۔ وہ بے دھیانی میں اپنی اس چوٹ کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''جب جیپ پانی میں گری، تم اس وقت کہاں تھے؟''

دلاور نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ کیسے اس نے جیپ کو لہراتے اور زوردار آواز سے پانی میں گرتے دیکھا۔ کیسے وہ پانی میں اترا، غوطہ لگایا، دونوں کو باہر لانے کے لیے اس نے کیا کیا کوشش کی۔ اس نے سب کچھ بتایا مگر ان جادوئی لمحوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جب اس نے سویرا کو بالکل سیدھا، ریت پر لیٹے دیکھا تھا...... اس کی نگاہیں، اس کے دلکش چہرے پر پیوست ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر وہ کچھ ہوا تھا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اردگرد کی ہر چیز کو فراموش کر کے اس کے بے مثل چہرے پر جھک

گیا تھا...... اور وہ یہ سب کچھ بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ یہ تو ایک ایسا سنہری راز تھا جسے وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں سویرا نے اچانک کہا۔

”دلاور! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ہمارے ساتھ یہاں اس حویلی میں ہی رہو۔ شاہ زمان صاحب کوئی بھی مناسب کام تمہارے اور ملتانی کے ذمے لگا سکتے ہیں؟“

کل شاہ زمان نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی تھی مگر دلاور کوئی جواب نہ دے پایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس حوالے سے اس کی دلی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس حویلی کو اور اس میں ”رہنے والی کو“ ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے...... اور کسی وقت دل میں آتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے اور پھر بھول کر بھی ان راہوں پر قدم نہ رکھے جو اسے اس حویلی کی طرف اور اس کے مکینوں کی طرف لاسکیں۔ اب بھی وہ سویرا کو کوئی ٹھوس جواب نہ دے پایا اور صرف اتنا کہا کہ ان کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ وہ اس بارے میں سوچے گا۔

ملازمہ شگفتہ ناشتے کے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سویرا بھی اپنے سیل فون پر کال سنتی ہوئی باہر نکل گئی۔ دلاور اور ملتانی وہیں بیٹھے رہے۔ ملتانی کو یہاں جو کچھ کھانے کو مل رہا تھا، اس نے اس کی ساری سوچیں اس کے معدے میں جمع کردی تھیں۔ وہ آج کل جیسے دماغ سے نہیں معدے سے سوچ رہا تھا۔ اس نے دلاور کو گردن سے پکڑ کر ذرا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”اوئے ناہنجار! کیوں عزت کی روزی روٹی کو لات مار رہا ہے۔ دو ٹکے کے لوگ نہیں ہم اور یہاں ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا جارہا ہے۔ اگر یہ لوگ آفر کررہے ہیں تو مان جا۔ اگر کچھ زیادہ نہ بھی ہوا تو ان کا چہیتا ملازم تو ضرور بن جائے گا تو...... اور چہیتے ملازموں کو یہ وڈے لوگ اپنی جان سے لگا کر رکھتے ہیں۔“

دلاور جیسے ملتانی کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں حویلی سے آگے، درختوں سے پرے...... مشرق کی جانب اس دشت کو دیکھنے لگا جسے مقامی لوگ روہی کہتے تھے۔ ان ریتیلے راستوں پر تند ہوائیں گشت کرتی تھیں۔ گرم جھونکوں کی تپش میں ایک بے نام سی اداسی اور تڑپ چھپی رہتی تھی۔ یہ ہوائیں اجنبی سناٹوں کی کوکھ سے جنم لیتی تھیں...... اور اجنبی سناٹے...... اس کا پہلا عشق تھے۔ اب یہ بے وجود عشق ایک ہیولے کی شکل اختیار کررہا تھا، ایک چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

☆☆☆

منظر ہال نما کمرے کا تھا۔ بیش قیمت قالین، شاندار مسہری، دلکش فانوس، کھڑکیوں پر بھاری کامدار پردے۔ سویرا گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں تھی۔ وہ مسہری کے پاس ہی غالیچے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی چچازاد رمشا، مسہری پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پاؤں سویرا کی گود میں تھے۔ سویرا اس کے پاؤں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی۔

رمشا نے کہا۔ ”یہ بندہ کوئی شے ہی لگتا ہے۔ کل میں نے اسے زمان بھائی کے ساتھ باغیچے میں گھومتے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ پی ٹی وی کی کسی سیریل سے کوئی پینڈو ہیرو اٹھ کر ہماری حویلی میں چلا آیا ہے۔“

”تو تیرے کیا ارادے ہیں؟“ سویرا نے ذرا شوخی سے کہا۔

”اگر تیری طرح میرے گلے میں بھی منگنی والی رسی نہ ہوتی تو ہوسکتا تھا میں اسے...... تین لفظ بول دیتی۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولی۔

”ہائیں، تین لفظ؟“ سویرا نے آنکھیں نکالیں۔

”یعنی شادی سے پہلے ہی اسے طلاق طلاق کہہ دیتیں۔“

”صرف یہی تین لفظ نہیں ہوتے۔ آئی لو یو بھی تو تین لفظ ہوتے ہیں۔“ رمشا نے کہا اور شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

”دُرفٹے منہ تیرا...... اور تیری عقل کا بھی۔“ سویرا نے اطمینان سے کہا۔

”اور تیری عقل بھی کوئی آسمان کو نہیں چھو رہی۔ یہ طلاق والا لفظ عورتیں نہیں بولتیں۔ انہیں کچھ کہنا ہی پڑے تو پھر کہتی ہیں۔ خلع...... خلع...... خلع......“

”اچھا بکواس بند کر اپنی۔“ سویرا نے قدرے بیزاری سے کہا۔

رمشا نے مسہری چھوڑی اور دھپ سے سویرا کے سامنے غالیچے پر آبیٹھی۔ سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں تجھے ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔“

”کیا؟“

”میں کل کچن سے نکل رہی تھی کہ اچانک بڑی آپا کی آواز کان میں پڑی۔ وہ تمہاری شادی کی بات کررہی تھیں، بے بے جی سے۔“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ سویرا نے نظریں جھکائے

السلام علیکم

ہمیں اپنے نئے بلاگ (ویب سائیٹ) کے لئے رائٹرز کی ضرورت ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی ممبر ناول، افسانہ، ناولٹ لکھنا چاہے تو ہم سے کانٹیکٹ کر سکتے ہیں۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتہ کے اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ہمیں ای۔میل کریں یا ان بکس میں میسج کریں۔

شکریہ

Email Address: - aatish2kx@gmail.com

جھکائے پوچھا۔

"دل میں لڈو پھوٹنے لگے ہیں نا...... دیکھو دیکھو ذرا...... میری سوہنی سہیلی کا مکھڑا کیسے لال گلابی ہوتا جا رہا ہے۔"

"اپنی چونچ بند کرو اور اگر کوئی بات ہے تو بتا۔"

"بڑی آپا، بے بے جی سے کہہ رہی تھیں۔ وڈے بھا (شاہ فرمان) نے کہا ہے، دسمبر میں بہت سے کاروباری مسئلے ہیں، زمینوں کے ٹھیکے وغیرہ دینے ہیں اور بھی کئی کام ہیں، شاہ زمان کی شادی دسمبر کے بجائے اکتوبر میں ہی رکھ لی جائے۔"

سویرا کے دودھیا چہرے پر اب واقعی سرخی دوڑ گئی۔ یہ شرم کی سرخی تھی۔ اس کا سر جیسے بے ساختہ جھک گیا۔

رمشا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سویرا! تمہیں یقین ہے کہ شاہ زمان تمہیں بہت چاہتا ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" سویرا نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تم شہر کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شاہ زمان بھی کوئی ان پڑھ نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ زمینداری والا ذہن رکھتا ہے۔ یہاں حویلی کا ماحول بھی تم سے کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اس کے مزاج کو اور یہاں کے رسم و رواج کو بدل پاؤ گی؟"

"ارادہ تو مضبوط ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

رمشا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اور اگر...... کچھ غلط ہونا شروع ہو گیا تو؟ میرا مطلب ہے...... مثلاً...... اگر...... دو چار سال بعد...... اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شاہ زمان نے بھی......"

سویرا نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور تیز لہجے میں بولی۔ "نہیں رمشا! میں نے کہا ہے نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے...... حویلی بھی بدل رہی ہے۔ ہمیں اچھے کی امید رکھنی چاہیے اور یہ امید میرے اندر موجود ہے۔"

"لیکن...... فرض کرو...... ایسا ہو گیا تو...... کچھ عرصے بعد تم سے شاہ زمان کو بانٹنے کے لیے کوئی اور آ گئی تو؟"

"تمہیں کہا ہے نا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا......" شاید سویرا کچھ اور بھی کہتی لیکن اسی دوران میں کہیں پاس سے وڈے بھا شاہ فرمان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی اور دونوں لڑکیاں جیسے ڈر کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

دلاور بہت بے چینی میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے سینے میں پنپ رہا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ہو نہیں سکتا۔ وہ محلوں میں پلنے والی شہزادی تھی، وہ ایک بے نام بے ہنر بے کار انسان تھا۔ ان کا میل ہوتا بھی تو کیسے؟ اس نے اس کی جان بچائی تھی، وہ اس کی عزت کرتی تھی، اسے خاص اہمیت دیتی تھی مگر یہ کوئی فلمی سچویشن تو نہیں تھی کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔ اپنی منگنی تڑوا دیتی اور اس کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں محبت کی پینگیں بڑھانے لگتی۔ کسی وقت وہ سوچنے لگتا تھا کہ جونہی شاہ زمان گاؤں واپس آئے گا، وہ اس سے سیدھی سیدھی بات کرے گا اور اس سے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔

کسی وقت اس کے دماغ میں وہ تہ خانے اور لکڑی کے ڈبوں والے مناظر بھی چکرانے لگتے تھے۔ اس کا فطری تجسس بیدار ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ وہ کیا قصہ تھا۔ اب بھی رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا اور وہ انہی سوچوں میں گم مہمان خانے کے وسیع برآمدے میں چکرا رہا تھا۔ اس کے قدم جیسے بے ساختہ اس تہ خانے کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی وہ تہ خانے سے کافی فاصلے پر ہی تھا کہ اسے دو پرچھائیاں بڑی تیزی سے چھت پر حرکت کرتی نظر آئیں۔ یہ یہاں کے پہریدار تو نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچانک تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کوئی بلند آواز سے للکارا۔ "اوئے...... کون ہو تم...... کون ہو......" اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز آئی۔ تاریکی میں شعلہ سا چمک کر رہ گیا۔ آٹومیٹک رائفل کا فائر ایک زبردست ہنگامے کی شروعات ثابت ہوا۔ ایک دم ہی جیسے حویلی کا سناٹا چکنا چور ہو گیا تھا۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں آئیں، دروازے دھڑدھڑائے، کھڑکیاں کھلیں، بلب روشن ہوئے اور پھر جیسے کہرام سا مچ گیا۔ ایک دم ہی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

دلاور نے خود کو ایک چوکور ستون کی اوٹ میں کر لیا۔ ہر طرف چنگاریاں سی بکھر رہی تھیں۔ اصطبل کی طرف گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ ملازم بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ وہ بدحواس بھینسے کی طرح عین گولیوں کی زد میں جا رہا تھا۔ دلاور نے عقب سے اس کی قمیص کا کالر دبوچا اور گھما کر ایک چٹائی پر پھینک دیا۔

ملتانی ہراساں آواز میں بولا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے دلاور؟“
”برات روانہ ہو رہی ہے تیری...... دیکھ نہیں رہا، فائرنگ ہو رہی ہے۔ سر نیچے رکھ۔“ آخری الفاظ دلاور نے چلا کر کہے اور خود بھی ستون کی اوٹ میں سمٹ گیا۔
چند گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے بالکل پاس سے گزریں۔ یکایک ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور اوندھے منہ ان سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر گرا۔ دلاور نے پہچان لیا۔ یہ حویلی کا ہی ایک کارندہ تھا۔ گولی غالباً اس کی کمر میں لگی تھی اور وہ گرتے ہی بے حرکت ہو گیا تھا۔
وہ جس جگہ پڑا تھا، وہاں اسے کسی بھی وقت مزید گولیاں لگ سکتی تھیں لیکن اسے وہاں سے ہٹانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہٹانے والا براہِ راست گولیوں کی زد میں آجاتا۔ آخر دلاور کی فطری دلیری نے اسے مہمیز کیا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر...... اور لپک کر، مضروب تک پہنچ گیا۔ اس نے اس کا ایک بازو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا محفوظ آڑ میں لے آیا۔
یہی وقت تھا، جب پیر فضل بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔
”شاباش دلاور! تم نے بڑی ہمت دکھائی۔ ورنہ یہ مارا جاتا۔“ اس کا اشارہ زخمی کارندے کی طرف تھا۔
”یہ کیا ہو رہا ہے فضل صاحب؟“ دلاور نے پوچھا۔
”حضور چانڈیو کے بندے گھس آئے ہیں۔ حرامزادے پکھیرو لینے آئے ہیں۔ پکھیرو تو ان کو ملے گا ایسا کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔“
اسی دوران میں دو کارندے زخمی کارندے کو اٹھا کر مہمان خانے کے اندرونی کمروں کی طرف لے گئے۔ حویلی کا خاص کارندہ شیرو دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی رائفل کی نال سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ بھاری بھرکم چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ تہ خانے کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے تمتمائے چہرے کے ساتھ پیر فضل کو اطلاع دی۔ ”پکھیرو کو کچھ نہیں ہوا جی۔ وہ کنجر سیڑھیوں تک تو آگئے تھے مگر اندر نہیں جاسکے۔“
دو گولیاں شیرو کے بالکل قریب دیوار پر لگیں اور بہت سا پلاستر اکھڑ کر برآمدے کے فرش پر جا گرا۔
شیرو نے دانت پیس کر ایک گالی دی اور جوابی فائرنگ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ پیر فضل نے بھی اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے برآمدے کے آخری سرے پر جا کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں۔ اسی دوران میں پیر فضل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی...... پھر گرج کر بولا۔ ”حضور چانڈیو کے بندے ہیں۔ آج ان بدمعاشوں کو ایسا مزہ چکھادو پھر کبھی ایسی جرأت نہ کریں۔“ وہ بات کرتا ہوا اور دیوار کی آڑ لیتا ہوا آگے نکل گیا۔
دلاور گم صم کھڑا تھا۔ حضور چانڈیو، تہ خانہ ...... پکھیرو...... یہ سب کیا گورکھ دھندا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں لکڑی کے ان ڈبوں میں پکھیرو یعنی پرندے تو بند نہیں تھے۔ ڈبوں میں سوراخ تھے اور اس رات دلاور کو ایک ڈبے سے پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دی تھی۔ اگر یہاں کسی پرندے کی بات ہو رہی تھی تو پھر وہ کیا ہو سکتا تھا؟ کہیں یہ کوئی باز یا عقاب قسم کی چیز تو نہیں تھی؟ اسے معلوم تھا کہ یہ زمیندار وڈیرے باز عقاب اور شاہین وغیرہ کے شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔
اچانک دلاور کو بالائی منزل سے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بالائی برآمدے میں اسے بڑی آپا دکھائی دیں۔ وہ ایک حملہ آور پر جھپٹی تھیں اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رائفل بردار نے بھنا کر بڑی آپا کو زور سے دھکا دیا۔ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی کئی فٹ نیچے گریں۔ یہ منظر کسی اور نے بھی دیکھا تھا اور جس نے دیکھا تھا، وہ طیش سے دیوانہ ہو کر حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا اور یہ جھپٹنے والا کوئی اور نہیں تھا سویرا تھی۔ وہ شیرنی کی طرح اس ”حملہ آور“ پر آئی جس نے بڑی آپا کو دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس نے یہ ہاکی پورے زور سے حملہ آور کی کلائی پر ماری۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر جنگلے سے ٹکرائی اور پھر نیچے احاطے میں جا گری۔ سویرا نے دوسرا وار حملہ آور کے سر پر کیا۔ یہ وار حملہ آور نے اپنے ہاتھوں پر روکا اور سویرا سے ہاکی چھیننے کے لیے اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دلاور نے یہ منظر دیکھا تو اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اس کی جان تھی۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ سانس بن کر اس کے سینے میں چل رہی تھی۔ وہ برآمدے میں اندھا دھند بھاگتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا۔ کئی گولیاں اس کے آس پاس سے گزری ہوں گی لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی برآمدے میں آگیا۔
جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، حملہ آور کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ حملہ آور سویرا سے ہاکی چھین نہیں پایا تھا۔ وہ

اب بے دریغ اسے پیٹ رہی تھی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ حملہ آور کا ایک ساتھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں قریباً نو انچ لمبے پھل کا تیز دھار چاقو تھا۔

وہ سویرا پر جھپٹ رہا تھا جب دلاور اس کے راستے میں دیوار بن گیا۔ حملہ آور نے دیوانہ وار ہاتھ چلایا۔ چاقو دلاور کی چھاتی کو افقی رخ پر چیرتا ہوا نکل گیا۔ ایک آتشیں لکیری دلاور کے سینے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔ پہلا وار سہنے کے بعد اس نے دوسرے وار کا موقع نہیں دیا اور وحشت کے عالم میں چاقو بردار کو روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ دلاور کے سر کی ایک خوفناک ضرب اپنے چہرے پر کھانے کے بعد چاقو بردار، جنگلے سے ٹکرانے کے بعد کوئی پندرہ فٹ نیچے پختہ صحن میں گرا اور پھر بری طرح لنگڑاتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ فائرنگ کی شدت اب حویلی کے عقبی گیٹ کی طرف تھی اور اس صورت حال سے پتا چل رہا تھا کہ باقی حملہ آور بھی تیزی سے پسپا ہو رہے ہیں۔

سویرا نے اسی اثنا میں حملہ آور کی ایک دو ہڈیاں مزید توڑ ڈالی تھیں۔ پھر حویلی کے مسلح محافظ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے زخمی کو دبوچ لیا۔ یہی وقت تھا جب سویرا کی نگاہ دلاور کے خون سے لت پت سینے پر پڑی۔ چاقو گہرائی میں تو نہیں گیا تھا مگر اس کے سینے کے گوشت کو چوڑائی کے رخ پر ایک طویل کٹ لگا گیا تھا۔ سویرا ملازموں کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ”ان کو اسپتال لے جاؤ۔ جلدی کرو...... بہت خون نکل رہا ہے۔“

☆☆☆

دلاور کو بہاولپور کے بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی چھاتی پر کافی سارے ٹانکے لگے اور خون کی ایک بوتل بھی دینا پڑی۔ اگلے روز سویرا اور شاہ زمان اس کی تیمارداری کے لیے اسپتال بھی آئے۔ یہ شاہ زمان کا اثر رسوخ تھا کہ اسپتال کا عملہ اور ڈاکٹرز وغیرہ اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی ایک فوج تھی۔ کچھ اسپتال کے اندر تھے، کچھ باہر۔

شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے دلاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”تم ہمارے لیے بڑے لکی ثابت ہو رہے ہو۔ شاید تم بروقت وہاں نہ پہنچتے تو سویرا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا۔“

شاہ زمان کی بات پر دلاور بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ نہ صرف بروقت وہاں پہنچا تھا بلکہ اس نے سویرا کی طرف بڑھنے والا مہلک چاقو بھی اپنی چھاتی پر جھیلا تھا۔ غالباً سویرا کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہاں ان لمحوں میں اصل صورت حال کیا ہوئی تھی۔

دلاور نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ”بڑی آپا صاحبہ کا کیا حال ہے؟“

”وہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہوش میں بھی آ گئیں۔“ سویرا نے جواب دیا۔

”اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔“ دلاور نے تہِ دل سے کہا۔

”اب ہم نے تمہیں کہیں جانے نہیں دینا۔ تم واقعی ہمارے لیے بہت لکی ہو۔“ شاہ زمان نے کہا۔

”میں کس قابل ہوں جی۔ یہ تو آپ کی نظر کی مہربانی ہے۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں حویلی میں کوئی ملازمت دینا چاہتا ہوں، تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

”آپ مجھے جس کام کے قابل بھی سمجھیں گے، میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی لیکن......“

”لیکن نہیں......“ شاہ زمان نے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن کے بعد بہانہ شروع ہو جاتا ہے۔“ پھر وہ اپنی گھنی مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ”تم نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں اب نہیں چاہتا کہ تم ہماری نظروں سے دور رہو۔“

اس نے دوبارہ دلاور کو سرتاپا دیکھا۔ جیسے نظروں نظروں میں اس کی جسمانی طاقت اور ذہنی چستی کو تول رہا ہو۔ اس کی نگاہوں میں دلاور کے لیے چاہت تو تھی لیکن اس چاہت میں مفاد اور ملکیت کا احساس بھی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک طرح کا احسان بھی تھا۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... تمہاری حیثیت اور حسب نسب اس قابل تو نہیں کہ تمہیں اپنے اتنا قریب رکھا جائے لیکن چونکہ حالات نے تمہیں ہماری ایک بے مثال ”خدمت“ کا موقع دیا ہے اس لیے تمہیں برداشت کیا جا سکتا ہے...... اور آگے بڑھنے کے موقعے بھی دیے جا سکتے ہیں......

وہ بولا۔ ”تم اسپتال سے ڈسچارج ہو کر سیدھے حویلی جاؤ گے۔ سمجھو یہ تمہارے لیے میرا پیار بھرا حکم ہے۔ میں بھائی صاحب (شاہ فرمان) سے بات کرلوں گا۔ وہ تمہیں اور تمہارے دوست کو مستقل طور پر حویلی میں رکھنے کا انتظام کرلیں گے......“

دلاور نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

شاہ زمان نے مختصر الفاظ میں دلاور کو بتایا کہ حویلی میں گھس کر فائرنگ کرنے والے ان کی ایک مخالف پارٹی کے لوگ تھے۔ ان کو قرار واقعی جواب ملا ہے۔ ان کا ایک

بندہ جان سے گیا ہے۔ وہ سخت زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف دو ایف آئی آر بھی کٹوائی گئی ہیں......

وقتِ رخصت شاہ زمان نے دلاور کا شانہ تھپکا تو سویرا نے بھی کمال بے تکلفی سے، اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت فرینک...... بے جھجک اور شفاف لڑکی تھی۔ اندر باہر سے ایک جیسی، کوئی بناوٹ نہیں تھی اس میں۔ دلاور نے کئی بار دیکھا تھا وہ حویلی کے عام ملازموں میں گھل مل جاتی تھی۔ ان کے کوارٹرز میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی تھی۔ شاہ فرمان اور شاہ زمان کی پروا کیے بغیر ملازمین کے دکھ درد میں شریک ہوجاتی تھی۔

کمرا وہی عالی شان تھا جس میں اس نے سویرا کی یاد میں بے چین راتیں گزاری تھیں۔ اس کی تیمارداری ہونے لگی۔ اس کی بہترین نگہداشت ہونے لگی۔ زخم دینے والا چارہ گر بن جائے تو قیامت ٹوٹتی ہے۔ دلاور پر بھی دن رات قیامت بیتنے لگی۔

سویرا حویلی کے گھٹے ہوئے ماحول کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ دوپہر اور رات کا کھانا اپنے سامنے ملازمہ سے لگواتی اور جب تک وہ کھانہ چکتا، وہ وہیں رہتی۔ اکثر اس کے ساتھ رمشا بھی ہوتی۔ وہ دن رات دلاور کے لیے کیف آور تھے اور اذیت ناک بھی۔ جب تک سویرا وہاں رہتی وہ گھڑیاں اس کی خوشبو سے معطر رہتیں۔ وہ چلی جاتی تو اذیت کا زہریلا دھواں اس کے سینے میں بھر جاتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس نے دو تین بار چاہا کہ سویرا سے اس ہنگامے کے بارے میں تفصیل سے پوچھے جس نے حویلی میں تہلکہ مچایا تھا لیکن نہیں پوچھ سکا۔ نہ ہی اس نے سویرا کو یہ بات بتائی تھی کہ اسے چھاتی پر لگنے والا زخم دراصل اسے بچاتے ہوئے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں سویرا سے بات چھپانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایسی ہی دھوپ چھاؤں والی دوپہر تھی۔ سویرا ملازمہ کے ساتھ...... دیسی بٹیر کی یخنی اور مکئی کی روٹی لے کر آئی تھی۔ رمشا آج اس کے ساتھ نہیں تھی۔ ملازمہ کھانا چن کر چلی گئی۔ سویرا روزانہ تر و تازہ ہوتی تھی مگر آج کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر یخنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم نے ابھی تک شہر تو بہت سے گنوائے ہیں مگر یہ بتایا ہی نہیں، تم پیدا کس شہر میں ہوئے؟''

''سویرا بی بی! مجھے معلوم ہی نہیں......'' وہ اداسی سے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' سویرا نے حیرانی سے کہا۔

''سویرا بی بی! میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سمجھیں میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔'' وہ تھوڑا سا آگے ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ بہت میٹھے اور نرم لہجے میں بولی۔

''تم خود کو اکیلا مت سمجھو...... ہم سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔'' اسے لگا کہ اتنی سی بات دلاور کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ وہ چند لمحے سر جھکائے دلاور کو خاموشی سے دیکھتی رہی پھر جیسے کچھ سوچ کر ایک دم سے چہکی۔ گردن کو ایک زاویے پر حرکت دے کر بولی۔

''آج میں تم سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ چلو ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے تم اور میں اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے، مجھے سویرا بی بی نہیں بلکہ صرف سویرا کہو گے۔ مگر تب جب صرف تم اور میں اکیلے ہوں گے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں سویرا بی بی ہی چلے گا...... سمجھے تم۔'' دلاور کو اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گنگ ہوکر رہ گیا تھا۔

وہ پھر سے بولی۔ ''اور دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ دوست سے کوئی بات بھی چھپائی نہیں جاتی۔'' پہلی بار دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ یوں نظر آتا تھا جیسے روتا بچہ من پسند کھلونا مل جانے کے بعد آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے لگے۔

سویرا پڑھی لکھی تھی۔ سندھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کرچکی تھی۔ کو ایجوکیشن میں ''یاری دوستی'' نبھا چکی تھی۔ شاعری اسے پسند تھی۔ خود بھی شعر لکھتی تھی۔

شاعر رومان پرور ہوتا ہے۔ شاہ زمان سویرا کے دور کے رشتے داروں میں سے تھا۔ کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں چار، چھ دفعہ یونیورسٹی جانا ہوا جہاں سویرا کی کشش نے اسے دیوانہ کردیا۔ یونیورسٹی کے چکر بڑھ گئے۔ کام لمبا ہوگیا، سویرا کے بچپن میں ہی اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ ماں یورپ کے کسی ملک میں تھی جبکہ باپ امریکا میں اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ سویرا کو اس کی پھپھو نے پالا تھا۔ کسی عید شب برات وغیرہ پر...... ماں باپ کی طرف سے علیحدہ علیحدہ کارڈ موصول ہوتے جن کو دیکھے بغیر وہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی تھی۔

اس کا کل جہاں اس کی پھپھو عالیہ ہی تھیں۔ پھپھو عالیہ سندھ یونیورسٹی کی پروفیسر اور بڑی آپا کی فرسٹ کزن تھیں۔ شاہ زمان نے بڑی آپا کے ذریعے سویرا سے شادی کا پیغام بھیجا...... جو چند ماہ کی سوچ بچار کے بعد پھپھو عالیہ نے سویرا کی رضامندی سے قبول کرلیا۔ شاہ زمان خوش شکل

تھا۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ والا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والی سویرا اور دنیا کو پڑھانے والی پھپھو عالیہ بخوبی جانتی تھیں کہ ایسے رشتے قسمت سے ہی دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ زمانہ خراب تھا۔ غیروں سے نمٹنے کی تاب پھپھو بھتیجی میں نہیں تھی...... اسی لیے کچھ تحفظات کے باوجود ہامی بھر لی گئی تھی۔ اب پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سویرا اپنی پھپھو اور ان کی بیٹی رمشا سمیت اس حویلی میں مقیم تھے۔

سویرا نے ماسٹرز کرلیا تھا۔ جس دن پھپھو کا ٹرانسفر بہاولپور یونیورسٹی میں ہوا، وہ لوگ سامان سمیت کر بہاولپور آ گئے۔ بہاولپور میں ہوتے ہوئے بڑی آپا انہیں کرائے کے مکان میں کہاں رہنے دے سکتی تھیں۔ وہ دوسرے دن ہی بہاولپور گئیں اور ان کو اٹھا کر حویلی میں لے آئیں۔

پھپھو عالیہ نے سو ہاتھ پیر مارے مگر بڑی آپا کے آگے ایک نہ چلی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ''حویلی اتنی بڑی ہے تین لوگوں کے آنے سے کم نہیں پڑنے والی اور اگر انکار کروگی...... تو...... رشتہ ختم......'' ظاہر ہے آخری بات انہوں نے مذاق میں کی تھی۔ چاروناچار انہیں بڑی آپا کی بات ماننا پڑی۔ ان کو اوپری منزل پر شاندار کمرے دے دیے گئے...... ایک کمرے میں پھپھو عالیہ رہ رہی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں سویرا اور رمشا تھیں۔

پھپھو عالیہ نے بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ جہاندیدہ اور دوراندیش پروفیسر تھیں۔ لالچی نہیں تھیں مگر زمانے سے خوبصورتی کا خراج وصول کرنا بھی اپنا حق سمجھتی تھیں۔ حویلی کھلے دل اور کھلے پیسے والوں کی تھی...... تین عورتیں تو کیا...... چوڑی حویلی تین سو لوگوں کو بھی خود میں سمو سکتی تھی۔

تو سویرا کی بات پر پہلی دفعہ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کے دل میں شادمانی ہلکورے لیتی تھی۔ سویرا نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، وہ ہاتھ کیسے جھٹک سکتا تھا۔ سویرا عجیب دل لگی کے موڈ میں تھی یا شاید وہ مغموم دلاور کا دل بہلانا چاہ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ''دلاور! تم نے لاہور تو دیکھا ہوگا...... بتاؤ کیسا ہے؟'' آنکھوں میں تجسس بھری چمک تھی۔

''اچھا ہے...... بلکہ بہت اچھا ہے۔'' اس نے کہا اور ذہن کے دریچے میں تنگ گلیاں اور ساتھ ساتھ جڑی چھتوں کی دھوپ پھیل گئی۔

''ایک دفعہ یونیورسٹی کا ٹرپ لاہور گیا تھا...... میں بیمار پڑ گئی، نہ جا سکی...... جس کا قلق ہمیشہ رہے گا۔''

''تو آپ اب چلی جائیں...... آپ کو کس نے روکا ہے۔'' وہ خاموشی کے خول سے رفتہ رفتہ باہر آنے لگا تھا۔

''تم چلوگے میرے ساتھ...... میں پرانا لاہور دیکھنا چاہتی ہوں...... تنگ گلیاں...... پُر پیچ بازار۔'' وہ خیالوں میں جیسے کہیں دور چلی گئی تھی......

''آپ جب حکم کریں گی...... مجھے تیار پائیں گی۔''

...... وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں...... گلابی ہونٹوں سے دور......

سویرا بازو میں پڑی چوڑی کو گھماتے ہوئے بولی۔

''دلاور! تم ہمیں بچاتے ہوئے اپنی جان پر کھیل گئے......''

''اس میں کوئی خاص بات تو نہیں سویرا......'' سویرا کہتے ہوئے وقت پیش آ رہی تھی مگر وہ کہنے پر مجبور تھا۔

''مگر لوگ ایسے نہیں ہوتے، کسی کے جھگڑے میں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے...... تم جو نظر آتے ہو، وہ ہو نہیں۔'' وہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تو دلاور گڑبڑا گیا۔ فوراً سنبھلتے ہوئے بولا۔

''آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا میں ایسا ہی کرتا۔'' سویرا بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ ملازمہ آن ٹپکی...... اس کی آمد سویرا کو بری لگی۔ وہ اسے کسی بہانے سے بھیجنا چاہتی تھی کہ رمشا سے بلانے آ گئی۔ دلاور نے غور کیا رمشا اور ملازمہ کی موجودگی میں سویرا پوری کی پوری ''سویرا بی بی'' نظر آنے لگی تھی...... پُروقار...... اور وضع دار۔

اگلے دو دن سویرا نہیں آئی۔ حویلی میں ایک عجیب سی ہلچل نظر آ رہی تھی۔ اس نے بلند کھڑکی کے پردے سرکا کر دیکھا تھا، حویلی کی باؤنڈری وال کے گرد خاردار تاریں لگائی جا رہی تھیں۔ ملازمین بڑی مستعدی کے ساتھ یہاں سے وہاں بھاگے چلے جاتے تھے۔ یہ تیسرے دن دوپہر کی بات ہے، سویرا ملازمہ کے ساتھ کھانا لے کر آئی۔ ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی تو سویرا بولی۔ ''تم میرا حال نہیں پوچھوگے، میں دو دن بیمار پڑی رہی۔''

دلاور کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ وہ شاید عشق کے ابتدائی اسباق کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تب اس کی ہلکی سی تکلیف بھی عاشق کو تڑپا دیتی ہے۔ یہ تیسرا موقع تھا جب وجود میں ہونے والی حیرت انگیز تبدیلی نے اسے پریشان کیا تھا۔ پہلا موقع تب آیا تھا جب وہ ڈوبتی سویرا کو بچا کر پانی سے باہر لایا تھا۔ وہ پہلی نظر پہلا احساس اور پہلا گھاؤ تھا۔ دوسرے موقع پر اس نے حویلی پر

حملے کے وقت سویرا کو ایک حملہ آور سے دست و گریباں دیکھا تھا اور ایک دم تڑپ سا گیا تھا۔ اب بھی سویرا نے اپنی بیماری کا بتایا تھا تو اس کا دل جیسے کسی غم کے اندھیرے کنویں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔

''سویرا! آپ اپنا دھیان رکھا کیجیے۔ آپ کمزور لگ رہی ہیں۔''

دلاور کی پریشانی سویرا سے چھپی نہ رہ سکی...... وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی...... پھر مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ویسے تمہیں خود پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔'' وہ رکی پھر بولی۔ ''ظفر بتا رہا تھا تمہارا زخم پہلے سے بہتر ہے۔''

''جی! میں کل چل کر باہر تک بھی گیا تھا......'' دلاور اندرونی کشمکش کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ دلاور کی اندرونی کیفیت کو سویرا نے جیسے اس کے چہرے سے پڑھ لیا تھا۔ دلاور خود میں پشیمان ہوا جا رہا تھا۔ اسی خفت کو مٹانے کی خاطر اس نے فوراً گفتگو کا رخ پھیرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''سویرا! ایک بات پوچھوں، آپ بُرا تو نہیں منائیں گی؟''

''ہاں بولو......''

''تھوڑے دن پہلے حویلی میں جو کچھ ہوا وہ سب کیا تھا؟''

سویرا ایک دم سے خاموش ہو گئی جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلاور جواب کا انتظار کرتا رہا، سویرا خاموش رہی تو وہ بولا۔ ''لگتا ہے...... آپ اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتیں۔''

اس کے جواب میں سویرا نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا جس سے دوپٹا کھسکا اور چند سنواری زلفیں چہرے پر پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ سے انہیں سر پر جمایا۔ وہ دوپٹا سر پر سیدھا کیا اور تھوڑا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں کہہ چکی ہوں...... دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی...... تو میں اس پر قائم ہوں۔''

سویرا نے محتاط اور مختصر لفظوں میں جو کہانی سنائی، وہ کچھ اس طرح سے تھی کہ حویلی پر حملہ ''شوکت سیال'' نے کروایا تھا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک ایم پی اے حضور چانڈیو کا جگری دوست تھا۔ شوکت سیال نہایت بدمزاج، منہ پھٹ اور بات بات پر لڑنے مرنے پر اتر آنے والا بندہ تھا۔ اسے حضور چانڈیو کی پوری پشت پناہی حاصل تھی۔ حویلی پر حملہ کسی ''باز'' کو چرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ ''باز'' نہایت قیمتی اور تربیت یافتہ ہے۔ پولیس کے پہنچتے ہی حملہ آور اپنے دو زخمی ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ ان کا ایک ساتھی دھر لیا گیا تھا۔ قیمتی باز محفوظ رہا تھا۔

حویلی پر حملے کا سن کر شاہ فرمان اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ فوراً کراچی سے واپس آ گیا تھا جبکہ شاہ زمان ایک دن بعد ترنڈا سے واپس پہنچا تھا۔

سویرا بات مکمل کر چکی تو دلاور کافی سنبھل چکا تھا، بولا۔ ''سویرا! کیا یہ باز بہت زیادہ قیمتی ہے؟''

''ہاں شاید...... سدھائے ہوئے عقاب قیمتی ہی ہوتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں کیا قیمت ہوگی اس کی......؟''

دلاور نے کہا تو سویرا نے بڑی دلچسپی سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''سننے میں آ رہا ہے...... آٹھ...... دس لاکھ کے قریب قریب ہوگی۔''

''مگر مجھے اس کے پیچھے کوئی اور کہانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ آٹھ دس لاکھ کے باز کے پیچھے حویلی پر اتنا بڑا حملہ...... اور آپ کے خیال کے مطابق حملہ شوکت سیال اور حضور چانڈیو نے مل کر کروایا ہے...... دس لاکھ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم تو نہیں ہے۔''

سویرا نے غور سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔

''مجھے لگتا ہے...... تم کسی سراغ رساں...... فرم کے لیے کام کرتے رہے ہو۔'' لہجے میں شوخی تھی۔ آج کی سویرا اور تھوڑے دن پہلے والی سویرا میں بہت فرق تھا۔ وہ دلاور سے یوں روانی سے باتیں کر رہی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو یا شاید یہ کو ایجوکیشن یونیورسٹی کے ماحول کا اثر تھا۔

دلاور ہنس دیا بولا۔ ''میں تو خود آج تک گم شدہ ہوں۔ میں کسی کا سراغ کیا لگاؤں گا۔''

دن گزرنے لگے۔ ہر روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ ایک علیحدہ کہانی ہوتی۔ ایک دن سویرا اپنی ڈائری لے کر آئی۔ اس پر نثر اور شاعری کی مشق کی گئی تھی۔ اس میں ایک آزاد نظم تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

نظم دلاور کے دل کو چھو گئی۔ وہ ہر لمحہ اس کی گردان

کرنے لگا۔ جس ڈر نے تھوڑے دن پہلے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی، وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وقت نے اسے ورغلالیا تھا۔ حالات نے اسے خاموش طوفانوں سے بے خبر کردیا تھا۔ وہ عشق کی منزلیں بڑی بے خبری سے طے کرنے لگا تھا۔ سویرا نے جو رومال اسے دیا تھا، وہ اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سویرا کی خوشبو رومال کے راستے اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوکر اور اسے مدہوش سا کردیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ دن بدن سویرا کے عشق میں ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا بوجھتا تھا پھر بھی عشق کی بے پناہ آگ کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔

وہ دھوپ بھرا بڑا چمکیلا ریگستانی دن تھا۔ دلاور کافی حد تک صحت یاب ہوچکا تھا۔ وہ بستر کی چادر درست کررہا تھا کہ سویرا آن ٹپکی! اس نے بے بی پنک کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر اسی کلر کا کیش کا دوپٹا تھا۔ آدھے بازو کے کناروں پر میرون کلر کے موتی جھول رہے تھے۔ ان کپڑوں میں سویرا کا حسن قیامت ڈھارہا تھا۔

وہ جھک کر بیڈ کی چادر درست کرواتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! جو کام تم کررہے ہو، یہ کام گھروں میں عورتیں کرتی ہیں۔''

''میرا کوئی گھر ہوتا...... تو شاید کوئی عورت بھی ہوتی اور اگر عورت ہوتی تو وہ چادر درست کرنے والا کام ضرور کرتی......'' دلاور نے مسکرا کر کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں...... عورت ہے...... کہاں؟''

وہ چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے بولی تو دلاور کا دل جیسے مٹھی میں آگیا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہوگئی۔ باریک دوپٹے کو سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں میں اس وقت تمہارے کمرے میں کیوں آئی ہوں...... حالانکہ دوپہر کے کھانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔''

''آپ خود ہی بتادیجیے۔'' دلاور نے نظریں جھکا کر کہا۔

''صبح...... شاہ زمان نے تمہیں بلایا ہے...... تم نے کیا فیصلہ کیا ہے......؟''

''کس بارے میں......؟''

''حویلی میں رہنے کے بارے میں...... میرا مطلب ہے مستقل طور پر رہنے کے بارے میں؟''

دلاور اسے کہنا چاہتا تھا۔ ''سویرا! اب اس حویلی کے سوا تو میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا ہے۔ حویلی بھی اس لیے کہ اس میں تم رہتی ہو...... تمہاری خوبصورت باتوں کی چہکار اس حویلی کی فضاؤں میں رقص کرتی ہے۔ تمہاری خوبصورتی کے رنگوں کی قوس قزح اس ماحول میں ٹھہری ہوئی ہے۔ جس ہوا کو میں اپنے پھیپھڑوں میں اتارتا ہوں، اس ہوا میں تمہاری سانسوں کی خوشبو گھلی ہوئی ہے۔ تمہارے چہرے کی ہنسی کے کھلتے گلاب میرے دل میں تہلکہ مچاتے ہیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ میں حویلی چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔''

وہ یہ سب کچھ اسے نہ کہہ پایا۔ نہایت دھیمی جھکی سی آواز میں بولا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب مجھے حویلی سے چلے جانا چاہیے۔''

''خبردار! ایسی بات دوبارہ کی تو...... تمہیں یہیں اسی حویلی میں رہنا ہے۔ یہی بات میں تمہیں کہنے آئی تھی......''

دلاور کا دل بھر آیا بولا۔ ''کس حیثیت سے...... کہنے آئی ہیں مس؟''

''ایک دوست کی حیثیت سے......''

''اگر نہ رہوں......؟''

''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا...... اور ایسے دوست کا...... جو خود کو تمہارا قرض دار بھی سمجھتا ہے اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' سویرا نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی......

چند لمحے دلاور خاموشی سے اس دروازے کو تکتا رہا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سویرا گئی تھی۔ پھر ڈھول پر ایک زوردار چوٹ پڑی...... ایک، دو، تین، چار...... دھن دھنا دھن دھن...... دھن دھنا دھن دھن...... ڈھول کی تھاپ پر میلے میں رقص کرنے والا ملنگ جیسے دیوانہ وار خون کی آبیاری کرنے والی رگوں میں دھمالیں ڈالنے لگا...... دلاور کا انگ انگ ناچنے لگا۔ اس کا دل پھڑ کنے لگا۔ سویرا خاص طور پر اسے کہنے آئی تھی کہ اسے حویلی میں ہر صورت رہنا ہے۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا۔ وہ تو حویلی سے اب دور رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو یوں ہی...... تکلفاً سویرا کو حویلی سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ کس کافر کو یہاں سے جانا تھا۔ صبح وہ شاہ زمان کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ فرمان بھی وہیں تھا...... اس کے چہرے پر سنگدلی اور بے رحمی کا کھچاؤ سا تھا۔ کثرت مے نوشی سے آنکھوں کے نیچے کا ماس ابھر آیا تھا۔ دلاور چند منٹ وہاں بیٹھا۔ بات ہوگئی۔ معاملات طے ہوگئے۔ دلاور کو ڈرائیور کم محافظ کی صورت میں رکھ لیا گیا۔ ڈرائیوری وہ بہت اچھے سے جانتا تھا۔ پنڈی میں جس دوست کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا، اس کی کار دلاور ہی ڈرائیو کرتا تھا۔

ان دنوں دلاور میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جن پر دہ

خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ کم گو، شرمیلا دلاور باتونی اور خوش اخلاق ہو گیا۔ عشق نے اس کے دل میں جوت جگائی تھی اور وہ سودائی ہو گیا تھا۔ جیسے صوفی اور ملنگ ہو گیا تھا۔

وہ ہر کسی کی خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ہر کسی کی مدد کے لیے کمربستہ رہنے لگا تھا۔

ایک دن وہ گاڑی چمکا رہا تھا۔ زنان خانے کی سواریوں کو لانے لے جانے کی ڈیوٹی اسی کی تھی۔ بڑی آپا نے "زہرہ پیر" جانا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت آئی جو ایک ٹانگ سے معذور تھی۔ اس نے آدھے چہرے کا نقاب بھی کیا ہوا تھا۔ دلاور نے اچٹتی نگاہ ڈالی تو نقاب کے نیچے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے ناک والی جگہ پر ناک نہ ہو...... کوئی خلا سا ہو۔ سارے رستے بڑی آپا دلاور سے باتیں کرتی رہیں، وہ ان کے جواب دیتا رہا۔ اپنی پرانی کہانیاں بھی سناتا رہا مگر اس کا ذہن نقاب والی عورت میں اٹکا رہا۔ وہ عورت سارے رستے ایک دفعہ بھی نہیں بولی۔

آخر دلاور سے نہ رہا گیا بولا۔ "بڑی آپا! گستاخی معاف۔ مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا مگر پھر بھی میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ محترمہ کون ہیں؟"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا یہاں تک کہ دلاور کو پشیمانی ہونے لگی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

پھر اچانک بڑی آپا کی گمبھیر آواز گونجی۔ "یہ شاہ فرمان کی تیسری بیوی اور میری سوتن نگینہ ہے۔"

دلاور .... آگے کچھ نہ بول سکا۔ واپسی کا رستہ بھی خاموشی سے کٹا۔

ظفری دلاور کا روم میٹ اور حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ وہ دلاور سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ اس رات سوتے وقت دلاور نے داہنی طرف کروٹ لی اور ظفری سے بولا۔ "ظفری یار! یہ نگینہ بی بی کون ہیں؟"

"تو نے اسے کہاں دیکھا؟" ظفری حیرت سے بولا۔

"بڑی آپا کے ساتھ آج "زہرہ پیر" تک گئی تھیں۔"

"یہ بڑی لمبی اور دردناک کہانی ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کر بولا۔

"تو پھر سنانا...... میرا آج جلدی سونے کا موڈ نہیں ہے اور تو...... تو آدھی رات تک جاگتا رہتا ہے۔"

ظفری دلاور کی بات پر ہنس دیا اور بولا۔ "یارا! چوڈیرو حویلی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ چوڈیرو حویلی کے بڑے بوڑھوں کی ایک قدر مشترک تھی۔ وہ تین سے چار شادیاں کرتے تھے۔ یہ ریت ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ شاہ زمان تو ابھی جوان ہوا ہے۔ شاہ فرمان بڑا ہے اور اب تک چار بیاہ رچا چکا ہے۔"

"چار بیاہ......!" دلاور نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں چار بیاہ...... اور پانچویں کی باری بھی جلدی آ جائے گی۔ شاہ فرمان کی پہلی شادی بڑی آپا سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اگر اولاد ہوتی تو بھی وہ دوسری، تیسری، چوتھی شادی ضرور کرتا۔ دوسری شادی رخشندہ سے ہوئی...... جو بے اولادی میں ہی شادی کے تیسرے سال مرگئی۔ تیسری شادی نگینہ سے ہوئی...... اور اب چوتھی شادی شاہدہ سے ہوئی ہے۔"

"حویلی کی کوئی عورت نقاب نہیں کرتی مگر یہ نگینہ بی بی ... تو پوری کی پوری پردے میں تھیں، یہ کیا ماجرا ہے؟"

ظفری کے چہرے پر خوف پھیل گیا بولا۔ "یار! یہ شاہ فرمان بڑا ظالم بندہ ہے...... چوتھی شادی پر نگینہ نے واویلا مچایا اور طلاق مانگی تو شاہ فرمان نے اپنے ہاتھ سے اس کی ناک اور ہونٹ کاٹ ڈالے۔" ظفری کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"اور نگینہ نے احتجاج نہیں کیا؟"

"او بدھو، سائیں...... احتجاج کی وجہ سے ہی تو ناک اور ہونٹ کاٹے گئے تھے۔ اور ایک اور ستم ظریفی سنو۔ حویلی کی کوئی بہو نہ طلاق لے سکتی ہے، نہ حویلی سے بھاگ کر کہیں جا سکتی ہے۔ یہ چوڈیرو حویلی کا صدیوں پرانا اصول ہے...... جو ابھی تک چلا آ رہا ہے۔"

"ظفری! شاہ زمان کو سب بڑے سائیں کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ شاہ فرمان سے دس بارہ سال چھوٹا لگتا ہے۔"

ظفری بولا۔ "بدکرداری...... شاہ فرمان شروع سے ہی آوارہ اور بے پروا تھا۔ "بڑے سرکار" نے اپنی آخری وصیت میں شاہ زمان کو اپنا گدی نشیں چنا تھا۔ اسی وجہ سے اب شاہ زمان "بڑے سائیں" کے رتبے پر فائز ہیں۔"

"شاہ فرمان بڑا ہے، اسے بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی جب سب لوگ اس کے سامنے چھوٹے بھائی کو "بڑا سائیں" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"میرا نہیں خیال اس سے شاہ فرمان کو کوئی فرق پڑتا ہو بلکہ میرے خیال سے وہ اس میں خوش ہے۔ بڑے سائیں کہلوانے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ بہت سی پابندیاں ہیں۔ ایسی پابندیاں جو شاید شاہ فرمان جیسا عیش پرست بندہ نہیں نبھا سکتا...... اب اس دن حویلی پر ہونے والا حملہ ہی دیکھ لو...... وہ سب کچھ شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔"

"شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے؟ میں تمہارا مطلب

نہیں سمجھا......'' دلاور نے الجھن سے کہا۔ ظفری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ گہرا کش لے کر اسی سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگا کر دلاور کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

''یارا! اس حویلی کے ایک تہ خانے میں ...... قیمتی پکھیرو کچھ عقاب ٹائپ چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ بعد میں سدھائے ہوئے قیمتی پکھیرو...... عرب ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں اور عربوں سے لاکھوں کمائے جاتے ہیں۔ یہ سب کام شاہ فرمان کرتا ہے۔ ''بڑے سائیں'' یہ سب جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر آنکھیں موندھے ہوئے ہیں بلکہ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ ''بڑے سائیں'' بھی اس دھندے میں برابر کے شریک ہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لیے انجان بنے ہوئے ہیں۔''

''اچھا تو حویلی پر جو حملہ ہوا، وہ لوگ قیمتی پکھیرو چرانے آئے تھے۔'' دلاور نے کہا۔

ظفری مسکرادیا دائیں بائیں سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''چرانے نہیں آئے تھے بلکہ اپنا چرا کے لایا ہوا ایک قیمتی ''باز'' واپس لینے آئے تھے۔''

''چرا کے لایا ہوا باز...... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''او یارا...... ایک تو تمہیں بات بڑی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ شاہ فرمان نے اپنے سب سے خطرناک کارندے ''شیرو'' سے رحیم یار خان کے ایک کوٹھ سے ایک باز چوری کروایا اور حویلی میں لے آیا۔''

دلاور باز کے متعلق سویرا سے سن چکا تھا پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''کیا...... وہ باز...... قیمتی ہے؟''

''قیمتی نہیں بلکہ بہت قیمتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو...... وہ ایک سادہ چیک ہے۔'' ظفری نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہے اس میں؟''

''یہ بہت اندر کی باتیں ہیں...... رہنے دو......''

دلاور نے خاموشی اختیار کرلی تو ظفری خود ہی بولا۔

''تم پوچھو گے نہیں...... اندر کی بات کیا ہے؟''

دلاور ہنس دیا، بولا۔ ''خود ہی تو تم نے کہا تھا...... رہنے دو...... میں نے رہنے دیا......''

''او بدھو سائیں! تمہیں اپنا یار کہا ہے اور یار سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جاتی۔ حویلی میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ''شان'' نامی باز اتنا اہم اور قیمتی کیوں ہوگیا ہے۔ اصل میں اس کی وجہ دو شیخوں کی لڑائی بیان کی جارہی ہے۔''

''دو شیخوں کی لڑائی۔''

''ہاں...... ہاں...... ایک شارجہ کا کوئی بڑا بزنس مین ہے...... دوسرا دبئی کا ارب پتی امیر زادہ ہے۔ دونوں کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ دونوں شاہ کے دعوے دار ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں۔'' ظفری باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ دلاور اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ظفری کو دو بجے سے پہلے نیند نہیں آتی تھی مگر دو بجتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگتا۔ دلاور نے مسکرا کر اسے دیکھا، بستر پر اسے سیدھا کیا اور خود دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ آج رات نیند آنی مشکل تھی، اسے صبح سویرا کو یونیورسٹی لے کر جانا تھا۔ وہاں سے پھر سویرا کو بازار جانا تھا۔ وہ وقت کا حساب لگانے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو تو بن جاتی تھی۔ وہ گاڑی تھوڑی سست چلاتا تو تین گھنٹے بھی لگ سکتے تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے بہت وقت تھا۔ وہ سوچنے لگا سویرا سے کیا کیا باتیں کرے گا۔ سویرا کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ''باز والی بات'' میں بھی الجھا ہوا تھا۔

مگر صبح اس کے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ صبح سے گاڑی چمکائے جارہا تھا، وہ اس سیٹ کو بار بار صاف کررہا تھا جہاں سویرا نے آکر بیٹھنا تھا۔ سویرا تو آئی مگر اس کے ساتھ پھپھو عالیہ بھی تھیں۔ سویرا نے بہت ہلکا میک اپ کررکھا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ کوئی گلاب کی کلی کھلی ہے۔ گاڑی میں بیٹھی تو ہر سو اس کی خوشبو بکھر گئی۔ دلاور نے بیک مرر پہلے سے سیٹ کررکھا تھا۔ سفر شروع ہوا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سویرا کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کچھ خاموش تھی۔ سفر خاموشی میں کٹا۔ جو کچھ اس نے رات جاگ کر سوچ رکھا تھا، سب اس سے الٹ ہورہا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے خود بات کرنے کا سوچا مگر دونوں کی گمبھیر خاموشی دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی حویلی سے کسی کو لے جاتا تھا تو بے تکان بولتا تھا۔ پھپھو عالیہ، سویرا، رمشا، بڑی آپا سب سے بے تکلفی سے بات چیت کرتا تھا بلکہ سب مستورات اس کی ڈرائیونگ سے زیادہ اس کی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری سے خوش تھیں مگر آج کچھ گڑبڑ تھی...... دونوں عورتوں کی گمبھیرتا کے پیچھے کچھ ناپسندیدہ حالات کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

یونیورسٹی آئی تو پھپھو عالیہ اور سویرا اندر چلی گئیں۔ ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ دلاور نے اتر کر باری

باری دونوں دروازے کھولے۔ پہلے سویرا بیٹھی' بعد میں پھپھو عالیہ بیٹھیں مگر انہوں نے گاڑی کا دروازہ بند نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے بولیں۔ ''سویرا! یوں کرو تم اکیلی بازار ہو آؤ...... مجھے واپسی پر یہاں سے پک کر لینا۔'' سویرا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا...... دروازہ بند ہوا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالنے والا رنگیلا شخص دلاور کے وجود میں بھنگڑے ڈالنے لگا۔ اسے کانوں کے قریب ڈھول کی دھائیں دھائیں سنائی دینے لگی۔ سویرا اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی تھی۔

''سویرا! آج آپ کو اس طرح دیکھ کر میرا دل دکھی ہے۔'' دلاور ہمت کرتے ہوئے بولا۔

''تم کیوں دکھی ہو...... پریشان تو میں ہوں۔'' سویرا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''دوست کو پریشان دیکھ کر دوست تو دکھی ہوگا۔''

''ہاں...... شاید......'' سویرا گاڑی کے شیشوں سے پار کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

''بڑے کہتے ہیں کہ شیئر کرنے سے پریشانی کم ہوجاتی ہے۔ بوجھل دھڑکنوں کو قرار آجاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو...... پریشانی کم ہوجاتی ہے...... مگر واہموں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ پل پل ڈستے ہیں۔'' سویرا نے عجیب سے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو...... دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے آج سے پہلے سویرا کو یوں منتشر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور شروع ہوگیا۔ ''سویرا بی بی دیکھیں...... (اس نے جان بوجھ کر بی بی کا اضافہ کیا تھا) ''وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ اس کے دادا کے پڑدادا کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ ایک منفی جذبہ ہے جو بدگمانی سے جنم لیتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اتنی مختصر جیسے ایک سانس ابھی ہے...... دوسرے پل میں نہیں۔ اتنی چھوٹی زندگی کے لیے ...... اتنی فکر...... اتنی پریشانی...... کیوں......؟ ہمیشہ مثبت سوچو...... ہمیشہ...... اچھا سوچو......''

بیک ویو مرر میں دلاور نے دیکھا کہ سویرا کے خزاں رسیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔

دلاور کے دل میں خوشی ناچ اٹھی۔ وہ بولا۔ ''اچھا آپ ساری باتیں چھوڑیں ...... مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔''

''ہاں پوچھو...... ؟'' سویرا نے دوپٹا سر پر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی دلکش لڑکی...... واہموں...... اور اندیشوں سے اس قدر پریشان کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو دنیا کے سب سے خوبصورت رنگ اترتے ہیں۔ ان پیارے رنگوں سے دکھ کا رنگ میل نہیں کھاتا...... اس بدصورت رنگ کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دیجیے۔''

سویرا کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ چہرہ شرم سے گلنار ہوگیا۔ صنف نازک کو خود کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور دلاور نے یہ کام ایسے وقت میں کیا تھا جب سویرا غمگین تھی۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ سویرا کی پریشانی جو کوئی بھی تھی، وہ ایک لمحہ اس پریشانی کو کافور کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سویرا اپنی اصل حالت میں واپس لوٹ آئی۔

وہ واقعی ایک من موجی لڑکی تھی۔ وہ بازار گئی۔ اس نے بھرپور شاپنگ کی۔ دلاور کے لیے خوبصورت سی گھڑی خریدی۔ واپس آ کر خود اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پر باندھی اور بولی۔ ''شکریہ دلاور...... تم ایک بہترین دوست ہو......''

''مگر...... شاید...... یہ بہت قیمتی گھڑی ہے۔ میں اسے......''

سویرا نے اسے روک دیا۔ ''خاموش رہو...... یہ تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے...... YOU MAKE MY DAY''

واپسی پر دلاور تحفے کے بوجھ تلے دبا رہا۔ یونیورسٹی پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے سویرا نے خاموشی توڑی، شوخی سے بولی۔ ''اگر تم مجھے لاہور نہیں لے کر گئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہارا گھر تمہاری جنم بھومی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں تفصیل بتاؤں گا تو آپ ارادہ ترک کردیں گی۔'' دلاور بھی شوخی کے موڈ میں آگیا۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' وہ بچوں کی طرح منہ پھلا کر ایک ادا سے بولی۔

''جس گلی سے آپ کو گزرنا پڑے گا، وہاں سے دو انسان اکٹھے نہیں گزر سکتے۔''

''تو کیا ہوا...... میں تمہارے پیچھے چل پڑوں گی۔ تم مجھ سے آگے چلنا......''

''اس گلی میں اندھیرا اور سیلن زدہ بو ہوگی۔ ایک سائڈ پر گندی نالی ہوگی جہاں اکثر بچے رفع حاجت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ نظارہ سہہ پائیں گی آپ......؟'' دلاور کی ہنسی چھوٹ گئی...... سویرا نے ایک

جھرجھری سی لی......

دلاور، سویرا کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ کسی کے ہاتھ کا کٹا پھل نہیں کھاتی تھی۔ جس گلاس کو کسی نے چھوا ہوتا، وہ اس میں پانی نہیں پیتی تھی۔ پھپھو عالیہ اسے برہمن کہتی تھیں مگر وہ عادت سے مجبور تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی نے اس کی بے خبری میں اس کے ہونٹوں کو بہت دیر تک چھوا ہے۔

یونیورسٹی کا موڑ آنے والا تھا جب سویرا نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے تمہیں بہترین دوست کیوں کہا؟''

دلاور کو خاموش پا کر بولی۔ ''اس لیے کہ تم نے میرے کہنے پر حویلی سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اتنا بڑا فیصلہ ایک بہترین دوست ہی کر سکتا ہے۔''

دلاور کی زندگی نے یکایک ایک بہت بڑا موڑ لیا تھا۔ یہ موڑ اتنا بڑا تھا کہ دلاور خود بھی چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے پنڈی چھوڑا تھا، لاہور کو خیرآباد کہا تھا۔ کراچی سے بھاگ نکلا تھا مگر روہی کی فضاؤں میں کوئی سحر تھا۔ چولستانی ہواؤں کے جھونکوں میں ایک غیر مرئی گرفت تھی جن سے آزادی ناممکن تھی۔

وہ پورا کا پورا سویرا کے عشق میں بھیگ چکا تھا۔ بات دور نکل چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی وہ سوچنے لگا، جس شدت سے وہ سویرا کو چاہنے لگا تھا، کیا سویرا کے دل میں بھی، اس کے لیے کوئی جذبہ موجود ہے؟ جواب ''ہاں'' میں آیا۔ سویرا نے کچھ خوبصورت اشارے دیے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''دلاور! تمہیں حویلی میں رہنا ہے۔ میں یہی بات تم سے کہنے کے لیے آئی تھی۔'' پھر اس نے کہا تھا۔ ''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ایسے دوست کا جو خود کو تمہارا قرض دار سمجھتا ہے۔ اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اس کے دل میں کیا نہاں تھا۔ آج اس نے دلاور کو ایک خوبصورت سی گھڑی تحفے میں دی تھی اور کہا تھا۔ ''تم بہترین دوست ہو......'' اس نے دلاور کو اپنا بہترین دوست کیوں کہا تھا؟ کیا اس کے دل کا موسم تبدیل ہو چکا تھا؟ اس کے اور شاہ زمان کے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو چکی تھی؟ عورت کی دوستی سے غلط مطلب تو مرد لیتے ہی ہیں۔ کہیں وہ بھی تو غلط مطلب نہیں لے رہا تھا؟

ساری رات وہ جاگتا رہا۔ باتوں کی کڑیاں ملاتا رہا...... صبح تک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لکھنا جانتا تھا۔ جو باتیں زبان بیان نہیں کر سکتی تھی، اس نے خط میں لکھ دیں۔ کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ جس دن سویرا کا موڈ سب سے اچھا ہوگا۔ وہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس دن وہ کاغذ کا ٹکڑا سویرا کو تھما دے گا۔ اس کے بعد جو بھی ہو دیکھا جائے گا......

مگر اگلے آٹھ دس دن میں بھی وہ موقع پیدا نہ ہو سکا۔ پانچ دن کے لیے اسے شاہ زمان کے ساتھ رحیم یار خان جانا پڑا...... وہی قیمتی باز والا معاملہ تھا...... شاہ زمان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری سے یہ مسئلہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ چھٹے دن یہ لوگ حویلی واپس آ گئے...... تہ کیا ہوا کاغذ اس کی جیب میں ہی تھا۔ وہ دن میں کئی دفعہ ٹٹول کر اس کی موجودگی کا اندازہ لگاتا تھا۔ حویلی پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے رحیم یار خان میں پانچ دن کانٹوں پر بسر کیے تھے۔ اب حویلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ سویرا رمشا کے ساتھ فورٹ عباس رمشا کی کزن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سویرا کے بغیر اسے حویلی سونی سونی لگی...... ایک دم خالی اور بکواس۔ سویرا کی واپسی چوتھے دن ہوئی...... مگر اگلے تین دن بھی سویرا کی شکل نظر نہیں آئی۔ دلاور کے حلق میں نمکین آنسوؤں کا ذائقہ گھل گیا۔ پہلی دفعہ اسے سویرا پر غصہ آیا...... وہ سرتاپا انتظار بنا بیٹھا تھا اور سویرا کو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی...... اگلا سارا دن بھی گزر گیا مگر سویرا نہیں آئی۔ انتظار کی تاریکی طویل ہوتی چلی گئی۔ دیدار کا اجالا نہیں پھیلا۔ اس کا وجود مسلسل انتظار کی تپش سے چٹخنے لگا۔ رگ رگ میں آگ سی بھرنے لگی...... ایک دو دفعہ اس کا دل چاہا خط کو نکالے اور اس کے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

وہ ایک دھندلی یا شاید سیاہ دوپہر تھی۔ صحرا کے جنوب کی سمت سے دور کچھ بگولے سے اٹھے تھے جنہوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ صحرائی بگولے حویلی سے کئی میل دور دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بگولے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے جیسے سورج کو چھونا چاہتے ہوں۔

ظفری کمرے سے نکل کر حویلی کے جنوب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ کمرے سے نکلتے وقت اس نے دلاور سے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے...... ابھی تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا ہے...... میں سیبوں والی حویلی کے دروازے بند کر آؤں۔'' سیبوں والی حویلی احاطے کے اندر ہی ایک طرف واقع تھی۔

ظفری کو گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا

اور کوئی اندر آ گیا......

دلاور کا کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ وہ سویرا تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ سویرا کا دوپٹا سر سے اتر کر اس کے شانوں پر پھیل گیا۔ نسواری زلفیں منتشر ہوئیں تو دلاور کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بے ترتیب کھلے بالوں نے اس کے حسن کو کئی گنا زیادہ کر دیا تھا۔ وہ بال سمیٹ رہی تھی، سرکش ہوا شرارت کے موڈ میں تھی۔ سویرا نے شولڈر بیگ لٹکا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ پھر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے دلاور کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی شاہ زمان اور رمشا کے ساتھ بازار سے لوٹی ہے۔ شاہ زمان نے ایک مہنگی دکان سے سینڈوچ خریدے ...... رمشا اور شاہ زمان نے تو اپنے حصے کے کھا لیے۔ اس نے اپنا سینڈوچ بچا لیا پھر وہ دلاور کی طرف سیدھی ہوئی اور بولی۔ ''بوجھو ...... میں نے سینڈوچ کیوں نہیں کھایا......''

دلاور کے وجود میں تو ہر طرف آتش بازی چھوٹ رہی تھی مگر اس نے اپنے چہرے پر خفگی کا پہرا بٹھا لیا اور سویرا کے سوال پر کچھ نہ بولا۔

سویرا کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑا آگے ہوئی۔ دلاور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کیا بات ہے......کوئی مسئلہ ہے؟''

دلاور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس نے پورے پندرہ دن سویرا کا انتظار کیا تھا۔ اس نے ایک ایک سیکنڈ میں اسے سو سو دفعہ یاد کیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو آگے بڑھ کر سویرا کو گلے لگا لیتا...... تب تک اسے چومتا چلا جاتا جب تک انتظار کی کڑھن آنکھوں کے رستے بہہ نہ جاتی۔

سویرا کمرے میں بہت خوش خوش داخل ہوئی تھی مگر دلاور کو یوں دیکھ کر بجھ سی گئی تھی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھ کر دلاور کو فتح مندی کا احساس ہونا چاہیے تھا مگر اس کا دل غم سے بھر گیا۔ حلق میں پھندا سا لگ گیا۔

''مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر ایسا انجانے میں بھی ہوا ہے تو پلیز مجھے معاف کر دو۔'' سویرا نے بڑے دکھی لہجے میں کہا تو دلاور کا سینہ شق ہو گیا۔ جذبات کی شدت سے اس کی آنکھوں میں وہی نمی اُمڈ آئی جو تالاب کے پاس سویرا کو بچانے کے بعد اس کی آنکھوں میں در آئی تھی۔

وہ سویرا کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا، گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''سویرا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل...... میں......''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''اصل میں کیا......؟'' آنکھوں میں ہلکی سی شوخی کی چمک تھی۔

''اصل میں...... میں آپ سے ناراض تھا۔ اتنے دن آپ کی شکل نہیں دیکھ سکا اسی لیے دل تھوڑا سا باغی ہو گیا تھا اور پھر آپ کو بھی تو کوئی خیال نہیں آیا۔'' لہجہ دھیما اور شکوہ کناں تھا۔

''اب تو میں آ گئی ہوں نا...... اب خوش ہو جاؤ...... میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی سویرا کے لیے ایک چیز ہے جو وہ پچھلے چودہ پندرہ دن سے جیب میں ڈالے پھر رہا ہے مگر وہ اتنی ہمت اکٹھی نہ کر پایا۔

سویرا نے شولڈر بیگ سے سینڈوچ نکال کے دلاور کی طرف بڑھایا۔ سینڈوچ اس نے لے لیا اور بولا۔ ''آپ نے نہیں کھایا۔''

''نہیں ......تم کھاؤ......'' اس نے کہا اور شولڈر بیگ کی سائڈ والی زپ کھول کے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ بالوں کی ایک سرکش لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں پتا ہے میں آج بہت خوش ہوں۔ اتنی جتنی میں کبھی آج سے پہلے نہیں تھی۔'' دلاور کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں پڑے کاغذ کے ٹکڑے کو ٹٹولنے لگا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ چاہے وہ کتنی بھی غلط تھی، چاہے وہ کتنی بھی انوکھی تھی۔ ''تم نے کہا تھا...... ہمیشہ مثبت سوچنا چاہیے۔ میں نے تمہاری بات پر عمل کیا دلاور! اور یقین جانو، مسئلہ حل ہو گیا۔ تھوڑے دن پہلے جس وہم نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی، وہ ختم ہو گیا۔ میں بے چین کر دینے والے اندیشوں سے نکل آئی۔''

وہ پتا نہیں کن واہموں اور کیسے اندیشوں کی بات کر رہی تھی۔ دلاور کا دل تو بس کاغذ کے اس ٹکڑے پر اٹکا ہوا تھا جو اس کی جیب میں تھا۔ سویرا نے ایک دیدہ زیب کارڈ نکال کر دلاور کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''بوجھو...... یہ کیا ہے؟'' دلاور نے نفی میں سر ہلایا...... تو وہ بے حد شوخ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ شادی کا کارڈ ہے......''

''کس کی شادی کا......'' وہ ڈبے میں پیک سینڈوچ کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کس کی شادی کا ہو سکتا ہے......؟'' آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

''اب میں نجومی تو ہوں نہیں...... آپ ہی بتا دیجیے۔''

''نہیں، تم خود ہی پڑھ لو......'' اس نے کارڈ دلاور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دلاور نے کارڈ پڑھا۔ زمین و آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ دروازہ اتنی زور سے بجا کہ یوں محسوس ہوا چوکھٹ سمیت نیچے گر پڑا ہو۔ ظفری نے ٹھیک ہی کہا تھا، طوفان آ رہا ہے۔

سویرا سہم گئی، جلدی سے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے تیز آندھی آ رہی ہے۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ مڑی پھر رک کر بولی۔ ''میرا سرپرائز کیسا لگا؟'' جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجانا کس قدر مشکل ہوتا ہے، یہ اس روز دلاور کو معلوم ہوا۔

سویرا چلی گئی۔ اس کی خوشبو بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے رخصت ہو گئی۔ سویرا کی شادی کا کارڈ اس کے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پندرہ دن بعد اس کی شادی شاہ زمان کے ساتھ ہو رہی تھی۔ کراچی میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا، خدا نے اتنا زیادہ پانی ایک جگہ کیسے اکٹھا کر دیا ہے مگر آج اس کی آنکھوں میں شاید اتنا پانی خدا نے اکٹھا کر دیا تھا۔ ریت کے طوفان نے چوڈیرو حویلی، اس سے باہر روہی اور اس سے آگے منڈ بھیرو کے ریتیلے بازاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ دھڑا دھڑ بجنے لگے تھے۔ دلاور کی آنکھوں میں ویرانوں کی دھول تھی۔ اس کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔

اس رات اسے بخار ہو گیا۔ باہر ریتیلی آندھی کے جھکڑ چلتے رہے۔ وہ اپنے بستر پر پڑا بخار میں پھنکتا رہا۔ لاہور میں لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے ایک تنگ گلی والا بازار بائیں طرف اوپر کو چڑھتا تھا۔ اس بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں کا ایک گورکھ دھندا سا تھا۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی میں اس کا سارا بچپن گزرا تھا۔ نیم تاریک گلی کا سیلن زدہ ''تھڑا'' اس کی من پسند جگہ تھی۔

جس عورت کے پاس وہ رہتا تھا، وہ اس کی ماں نہیں تھی۔ چاچی...... ماسی...... نانی...... دادی بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کون عورت تھی وہ جس نے اسے پالا تھا۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو وہ عورت مر گئی۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بیٹھ کے وہ بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں رویا۔ رونا اسے اچھا نہیں لگتا تھا مگر آج وہ رونا دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ آج ایک جیتی جاگتی عورت نے اسے رونے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وجہ صاف تھی۔ یہ دلاور کی زندگی میں داخل ہونے والی دوسری عورت تھی۔

اگلے تین دن بھی اس کا بخار نہ اترا۔ ظفری اسے دوا لا کر دے رہا تھا اور مسلسل اس کی تیمارداری بھی کر رہا تھا۔ ظفری دلاور کے کہنے پر ہی ملتانی کو منڈ بھیرو سے بلالایا تھا...... ملتانی کے آنے سے ظفری کی ڈیوٹی کم ہو گئی۔ ملتانی، دلاور کی خدمت میں جت گیا۔

دلاور کی حالت سدھرنے لگی۔ بخار کم ہونے لگا۔ یہاں ہر گزرتے دن کے ساتھ دلاور ٹھیک ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہر گزرتے دن کے ساتھ حویلی کی سجاوٹ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ برقی قمقمے لگ رہے تھے۔ رنگ برنگی لائٹوں اور مصنوعی پھولوں سے حویلی کو لاد دیا گیا تھا۔ ویسے کے لیے بہت بڑے دسترخوان کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ دو ہزار کے قریب مہمانوں کی لسٹ تیار کی گئی تھی مگر سٹنگ اور کھانے کا انتظام اس سے بھی زیادہ کا رکھا جا رہا تھا......

شادی میں چار دن باقی رہ گئے تھے۔ ظفری کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ سویرا...... پھپھو عالیہ...... اور رمشا...... بہاولپور میں رمشا کے خالو کے گھر شفٹ ہو گئے ہیں۔ اب برات چوڈیرو حویلی سے بڑی آن بان سے نکل کر رمشا کے خالو کے گھر جانی تھی۔

شادی سے ایک دن پہلے دلاور ملتانی سے بولا۔ ''چل یار...... یہاں سے کہیں دور چلے جائیں...... اب میرا دل یہاں پر نہیں لگے گا۔''

''کہاں جائیں گے ہم؟''

''کہیں بھی مگر یہاں سے دور...... جہاں بہت ساری ہوا ہو...... میں کھل کے سانس لینا چاہتا ہوں...... یار...... یہاں کی ہوا ٹھیک نہیں ہے...... اس ہوا میں گندھک ملی ہوئی ہے۔ میرا سارا سینہ جھلس گیا ہے۔ میرا سارا حلق چھل گیا ہے......'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

دلاور کا درد بھرا لہجہ محسوس کر کے ملتانی چونک گیا۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوئے لالے! تیرے چہرے پر تو عشق کا پینٹ ہوا، ہوا ہے۔ مجھے ٹھیک سے بتا بات کیا ہے؟'' ملتانی دلاور کا رازدان تھا۔ اس کا اصرار بڑھا تو دلاور نے اپنی کہانی کے خاص خاص حصے سنا ڈالے۔ ملتانی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔

''یار...... یہ سب بہت برا ہوا۔'' ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے سر کو کھجایا اور پینترا بدل کر بولا۔ ''اب میں

تجھے یہاں زیادہ دیر رکنے نہیں دوں گا...... صبح ہوتے ہی ہم واپس منڈ بھیرو چلیں گے...... پھر اس سے اگلے دن ہم دونوں پنڈی چلے جائیں گے۔ ایک کام کا ٹھیکا ملا ہے مجھے، چار پانچ دن بعد جانا تھا مگر اب پرسوں ہی چلیں گے......"

ملتانی بڑے ٹھوس لہجے میں کہہ رہا تھا مگر دلاور جانتا تھا...... اب رہائی ممکن نہیں تھی۔ سویرا تو پرسوں دلہن بن کر اس گھر میں آرہی تھی، اپنی تمام تر کوششوں اور ارادوں کے باوجود وہ یہاں سے کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ عشق کی نادیدہ ڈور نے اس کے ہاتھ باندھ کر اس کے پورے وجود کو جکڑ دیا تھا۔

شاید یہ خود اذیتی تھی۔ وہ سویرا کی شادی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی...... یہ چوڈیرو گاؤں کے "بڑے سائیں" کی شادی تھی۔ جتنی بھی خوشی منائی جاتی کم تھی۔ طوفان آتے ہیں، تباہی مچاتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ شادی کا طوفان بھی ہر چیز کو نیست و نابود کر کے گزر گیا...... شادی کے بعد تین چار دن دلاور شراب کے نشے میں دھت اپنے بستر پر پڑا رہا۔ شراب کا حصول اس حویلی میں کون سا مشکل کام تھا۔

اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔ صرف سگریٹ پیتا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے نشہ شروع کر دیا۔ اس "بیماری" کو خود سے لپیٹ لیا جو اسے سویرا کی یاد سے نجات دلا سکتی تھی۔ شادی کے پانچویں دن ملتانی سو منت سماجت کے باوجود واپس لوٹ گیا۔ دلاور اس کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ ابھی اور اذیت سہنا چاہتا تھا۔

یہ شادی کے دو ہفتے بعد کی بات تھی۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب سویرا ٹہلتی ٹہلتی دلاور کے کمرے تک آگئی تھی۔ اس نے بڑی کامدار شال لے رکھی تھی۔ اب وہ چوڈیرو حویلی کی نئی بہو تھی...... اس کی چال میں ایک شاہانہ تمکنت آگئی تھی۔ وہ دلاور سے سخت خفا تھی۔ وہ شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً سویرا کو دلاور کی بیماری کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اس کا احوال جاننے کے لیے ہی ٹہلتی ہوئی اس طرف آنکلی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ دلاور اندر موجود نہیں تھا۔ ظفری بھی کسی کام سے نکلا ہوا تھا۔ سویرا اندر داخل ہو گئی۔ سارا کمرا بے ترتیب اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ اس کے دل میں خیال آیا کہ دلاور والی سائڈ کی چیزیں سنبھال دے مگر دوسرے لمحے ہی اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔

الماری کھلی ہوئی تھی، کپڑے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہینگر کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی۔ اس کو جھٹکا لگا۔ اس نے فوراً الماری بند کر دی۔ الماری کے ساتھ ہی ایک ادھ کھلا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ اس نے وہ کھولا، اس میں بہت سی چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ان بے ترتیب چیزوں میں سے اس نے لکڑی کا ایک خوبصورت ڈبا اٹھالیا۔ اس نے آہستگی سے اسے کھولا تو حیران رہ گئی۔ سب سے اوپر ایک رومال پڑا تھا۔ یہ وہی رومال تھا جو سویرا نے ایک بار دلاور کو آنسو پونچھنے کے لیے دیا تھا۔ رومال کے نیچے وہ گھڑی تھی جو سویرا نے اسے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اس سے نیچے ٹوٹی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے تھے۔ سویرا دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ یہ چوڑیاں اسی کی تھیں۔ پر یہاں کیسے پہنچی تھیں۔ چوڑیوں کے نیچے ایک کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ سویرا نے وہ کاغذ کھولا۔ خوش خط الفاظ میں نظم لکھی تھی۔ تم کب تک مجھ کو بھولو گے...... اس نے ساری نظم پڑھ ڈالی۔ یہ آزاد نظم اس کی تخلیق کردہ تھی۔ سویرا نے پلنگ کا پایہ تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ آج اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا تھا۔

☆☆☆

دلاور نہ زمین پر تھا نہ آسمانوں میں۔ اس کا وجود جیسے ہواؤں میں معلق تھا۔ ظفری اکثر اسے اپنی حالت سدھارنے کا کہتا۔ مگر کسی کے کہنے سے اس کی حالت کہاں سنبھلنے والی تھی۔ ظفری یہی سمجھتا تھا کہ دلاور گھریلو طور پر بے حد پریشان ہے۔ دلاور نے اسے اپنے گھر بار کے بارے میں دردناک من گھڑت کہانی سنا رکھی تھی اور یہ جھوٹ گھڑنے کا مشورہ دلاور کو ملتانی نے دیا تھا۔

دلاور اس وقت سیبوں والے باغ کی طرف چلا جارہا تھا۔ "سیبوں والا باغ" اصل میں وسیع و عریض چوڈیرو حویلی کا جنوب مشرقی حصہ تھا۔ یہاں کوئٹہ کا سب سے اچھا سیب لاکر پیک کیا جاتا تھا اور پھر مڈل ایسٹ میں ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ دلاور کی حالت ابتر تھی۔ اس کے بال الجھے، شیو بڑھی ہوئی تھی۔ شکل سے مہینوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ ظفری سیبوں والے باغ کا نگران مقرر تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ سیبوں کی پیٹیاں کنٹینر میں لوڈ کروا رہا تھا۔ سیبوں والے باغ میں آنے کا مشورہ ظفری نے ہی اسے دیا تھا۔ ظفری ہمدرد اور انسان دوست آدمی تھا۔ وہ

چاہتا تھا کہ دلاور اپنے کمرے میں پڑا رہنے کے بجائے چلے پھرے...... حویلی میں گھومے، خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرے جس سے اس کی موجودہ خراب طبیعت درست ہو۔
دلاور کو باغ میں آتا دیکھ کر ظفری کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری پھر گہری ہوگئی۔ وہ کنٹینر سے چھلانگ لگا کر اتر آیا بولا۔ ”یارا! بہت اچھا کیا تم ادھر آ گئے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا ایک سیب چکھا کر دلاور کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ ”یارا! خود کو سنبھالو...... نہاؤ...... شیو بناؤ...... اچھے کپڑے پہنو۔ بخار تو کب کا رخصت ہوگیا۔ تم اب اپنے ذہن سے پریشانی کو بھی رخصت کردو۔“

ظفری کی بات پر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ وہ دل کھول کے ہنسنا چاہتا تھا مگر اس کا دل مر گیا تھا۔ کوئی چیز کوئی منظر، کوئی بات بھی تو اسے اچھی نہیں لگتی تھی...... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے مرنے کے بعد بھی اس کی حالت کافی دن ایسی ہی رہی تھی۔ پھر تھوڑے دنوں بعد وہ بہتر ہوگیا تھا۔ کیا اب بھی ایسا ہوگا؟ تھوڑے دن...... کچھ ہفتے...... گزر جانے کے بعد وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا؟ جواب نفی میں آیا...... گھاؤ پہلے زخم سے زیادہ گہرا اور کاری تھا۔

ظفری...... سیبوں والا کنٹینر حویلی کی حدود سے باہر نکلوانے کے لیے چلا گیا اور دلاور کو تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ گیا۔

باغ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر تھوڑا اونچا تھڑا سا تھا جس پر فاصلے سے لوہے کے پائپ لگے تھے اور ان پائپوں کے اوپر ٹین کی چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ ٹین کی چھت کے نیچے جابجا پرالی بکھری ہوئی تھی۔ دھلے دھلائے سیب صاف کر کے خوبصورت کریٹوں میں پیک کیے جا رہے تھے۔ دھلے سیب دیکھ کر دلاور کے دل میں امید سی جاگی۔ وہ ٹین کی چادروں والی چھت سے پرے ہٹتا چلا گیا۔ وہ درختوں سے گھرے اس حجرے کی عقبی جانب بڑھ گیا جہاں سے دھلے ہوئے سیب لائے جا رہے تھے۔ دلاور کو من کی مراد مل گئی۔ حجرے کی بیک سائڈ پر پانی کا تالاب موجود تھا۔ ہیوی موٹر کی آواز گونج رہی تھی اور تقریباً پانچ انچ قطر کے پائپ سے جھاگ اڑاتا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔ یہ حوض نما تالاب کم و بیش تین سو مربع فٹ کا تھا۔ تالاب میں سے پانی نکال نکال کر سائڈ پر بنی ہوئی حودیوں میں سیب دھوئے جاتے تھے مگر اب نہیں دھوئے جا رہے تھے۔ دلاور نے تالاب کے قریب بیٹھے ایک ملازم سے اجازت لی اور

کپڑوں سمیت تالاب میں اتر گیا...... وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا۔ گہرے پانی کی مچھلی جو لاکھوں ٹن پانی کے دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے جس دباؤ پر چیزیں پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں، وہ سکون سے تیرتی ہے۔ دباؤ کی زیادتی اس کی زندگی...... دباؤ کی کمی اس کی موت ہوتی ہے۔ وہ سینے سے سانس نکال کر تالاب کے پیندے میں جا بیٹھا۔ تالاب دس فٹ کے قریب گہرا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ یہاں دنیا کی مصیبتوں، اس کے رنج و غم سے دور ہوگیا ہو۔ ہلکی ہلکی سرگوشیوں جیسی آوازیں تھیں جو اس کی سماعت سے ٹکراتی تھیں...... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے گھر اکثر وہی آدمی آیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ دلاور کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کا گھر والا ہے۔ اس کا نام سرفو تھا، مگر سب اسے سرفو دم گھٹ کہتے تھے۔ وہ راوی کے پانیوں کا کینجوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بغیر سانس لیے پندرہ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔ وہ جب بھی اس گھر میں آتا دلاور کو اپنے ساتھ دریائے راوی لے جاتا۔ خود پانی میں اترتا، اسے بھی غوطہ لگانے پر مجبور کرتا۔ اس وقت دلاور کی عمر سات آٹھ سال ہوگی (دلاور کا نام...... دلاور بھی اسی نے رکھا تھا) پانی کے اندر شروع شروع میں دلاور کی حالت بری ہوجاتی۔ وہ کھانستا، غوطے کھاتا، پانی ناک میں داخل ہوکر اس کا تالو چھیل دیتا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے مگر سرفو دم گھٹ کو اس پر رحم نہ آتا۔ ان لمحات میں سرفو دم گھٹ، دلاور کو دنیا کا سب سے ظالم انسان لگتا مگر اس سختی کے پیچھے ایک تربیت چھپی ہوئی تھی...... پتا نہیں کیوں سرفو دم گھٹ جاتے جاتے اپنا فن دلاور میں منتقل کرگیا۔ سخت، جان لیوا تربیت میں دلاور کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب گہرے پانی کی مچھلی بن گیا ہے۔ سرفو دم گھٹ کی تربیت قریباً تین سال تک جاری رہی۔ دلاور کو پالنے والی عورت کے مرنے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ وہ عورت دنیا سے کیا گئی، سرفو دم گھٹ بھی جیسے دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے بعد دلاور نے اسے کبھی نہیں دیکھا مگر تب تک ایک نایاب ہنر دلاور میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ جب حد سے زیادہ پریشان ہوا کرتا تو راوی کے پانی میں کود جاتا۔ کنارے پر کسی جڑ کو پکڑ کر تین چار منٹ تک زیرِ آب رہتا۔ جب سینے میں رکی سانس اس کے پھیپھڑوں کو جھنجوڑنے لگتی، وہ سطح آب پر آجاتا۔ سانس لے کر دوبارہ زیرِ آب چلا جاتا۔ آج بھی وہ ہمیشہ سے زیادہ دکھی تھا۔ حویلی میں تالاب نظر آیا تو جیسے وہ جی اٹھا اور پھر...... من پسند کھیل شروع ہوگیا...... وہ روز سیبوں والی حویلی میں آتا اور بہت دیر تک اپنا پسندیدہ کھیل کھیلتا۔ دم توڑتی مچھلی پانی ملنے سے دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ وہ بھی جیسے دوبارہ زندہ ہونے لگا تھا، دن بدن بہتری کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ پہلے وہ ہر دم نشے میں رہتا تھا مگر اب نشے والی حالت میں کمی ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں ایک روز ایک عجیب واقعہ بھی ہوا۔ تالاب میں غوطہ زن رہنے کے بعد دلاور پانی کی سطح پر ابھرا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر بڑی آپا، کٹی ناک والی نگینہ بیگم اور سویرا وغیرہ کھڑی تھیں۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر باغ کی سیر کو آئی تھیں۔ دلاور کا بالائی جسم عریاں تھا۔ بڑی آپا کی نگاہ سیدھی دلاور کی چھاتی پر پڑی۔ وہاں افقی رخ پر وہی دس بارہ انچ لمبا زخم تھا جو سویرا کو بچاتے ہوئے دلاور کے سینے پر آیا تھا۔ دلاور صرف شلوار میں تھا، اس نے باہر نکل کر جلدی سے چادر میں اپنا جسم لپیٹا اور مؤدب کھڑا ہوگیا۔ بڑی آپا نے کہا۔ ''دلاور! کافی لمبا پھٹ لگا ہوا ہے تجھے، شکر کر تیری جان بچ گئی۔''

دلاور نے کہا۔ ''جی ہاں، پھٹ تو لگا ہے...... لیکن اب پرانا ہوگیا ہے۔''

بڑی آپا کے پیچھے کھڑی ایک ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''توبہ اللہ جی۔ بڑی خطرناک لڑائی تھی وہ۔ جب چانڈیو کے بندے نے چاقو چلایا تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ اگر اس ویلے دلاور سامنے نہ آتا تو یہ چاقو...... اللہ نہ کرے سویرا باجی کو ہی لگنا تھا۔''

دلاور کو لگا جیسے اس کا کوئی قیمتی راز افشا ہوگیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سویرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ عورتیں اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگ پڑیں۔ دلاور موقع دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد دو تین ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ سویرا، شاہ زمان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایسی بیوی ثابت ہوئی تھی جو اپنی اطاعت، ناز و ادا اور موقع محل کے مطابق بات چیت سے خاوند کا دل جیت لیتی ہے۔ شاہ زمان اس کے حسن کا اسیر تو پہلے سے تھا۔ اب اس کی سیرت کا گرویدہ بھی ہو چلا تھا مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی رگوں میں جاگیردارانہ خون بھی دوڑتا تھا۔ وہ کسی وقت رات کو حویلی میں راگ رنگ کی محفل بھی جما لیتا تھا۔ سویرا دبی زبان میں اعتراض کرنے کے بعد خاموش ہوجاتی

تھی۔ ایک جوان چودھری کی حیثیت سے شاہ زمان ''نظربازی'' سے بھی باز نہیں آتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔شاہ زمان اور سویرا دالان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔چائے کا سامان میز پر ترتیب سے رکھنے والی ملازمہ ماروی تھی۔اس نے اپنا جسم باریک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔اس کے جسم کا انگ انگ چیخ چیخ کر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔شریف سے شریف انسان کی آنکھیں بھی اس کے قیامت خیز جسم سے ٹکرائے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس کا رنگ گندمی، چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔لانبی آنکھوں میں لگے کاجل میں حسن کی ایک داستان رقم تھی۔ اس کا حسن کسی بھی پارسا کا بیڑا غرق کرسکتا تھا۔

وہ جھک کر چائے بنا رہی تھی اور شاہ زمان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وقتاً فوقتاً اسے دیکھ رہا تھا۔سویرا کی لاعلمی کے دوران جتنی دفعہ اس کی نظر ماروی کی طرف اٹھتی، نگاہ کی پیش پہلے سے بڑھی ہوتی ...... عورت چار آنکھیں رکھتی ہے۔ سویرا سب جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔شاہ زمان نے اس کے انجان بنے رہنے کو اپنا کارنامہ سمجھا اور مزید دلیر ہوگیا۔وہ باتیں تو سویرا سے کررہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز ماروی تھی...... آخر سویرا زچ ہوگئی۔ اس نے تھوڑے سخت لہجے میں ماروی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو شاہ زمان یوں انجان بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو......

تھوڑی دیر پہلے سویرا بہت اچھے موڈ میں تھی مگر شاہ زمان کی نظربازی نے سویرا کے موڈ کا ستیاناس کردیا۔باقی وقت وہ خاموش رہی، صرف ہوں ہاں سے شاہ زمان کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔

اگلی رات، ڈنر میں کھانا سرو کرنے والی بھی ماروی تھی۔ بڑے ٹیبل پر کھانا لگایا گیا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے اور بظاہر شاہ زمان، شاہ فرمان سے باز کے سلسلے میں کوئی گرماگرم بحث کررہا تھا مگر اس کی نگاہیں ماروی کا طواف کررہی تھیں۔کھانا سویرا کے حلق میں اٹکنے لگا۔ ابھی تو اس کی شادی کو ڈھائی تین ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔شاہ زمان یہ کیا کررہا تھا۔آدمی عورتوں کی جانب دیکھتے ہیں مگر اس طرح دیکھنے اور شاہ زمان کے اب والے دیکھنے میں بڑا فرق تھا اور یہ فرق سویرا کو بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔اس نے اپنے دل کو لاکھ بہانے دے کر بہلا لیا کہ وہ یوں ہی شکی مزاج ہو رہی ہے۔آدمی عورتوں کی طرف دیکھتے ہی ہیں۔ اسے شاہ زمان کی نظر پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے لیکن ......

پھلکڑ

جنرل وارڈ میں ایک صاحب سے جن کا ابھی ابھی آپریشن ہوا تھا برابر میں لیٹے ہوئے مریض نے پوچھا۔''آپ کو آپریشن کے بعد کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

وہ صاحب بولے۔''اجی کیا پوچھتے ہو۔پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔''

پڑوسی مریض بولا۔''یہ ڈاکٹر صاحب دراصل بھلکڑ ہیں۔ایک آپریشن کے بعد انہیں مریض کا پیٹ دوبارہ کھولنا پڑا کیونکہ وہ اس کے پیٹ میں قینچی بھول گئے تھے، دوسرے مریض کے پیٹ میں چاقو بھول گئے تھے۔''

اتنے میں ڈاکٹر صاحب گھبرائے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے اور گھبرا کر بولے۔''بھئی کسی نے میری چھتری تو نہیں دیکھی؟'' اتنا سننا تھا کہ آپریشن والے صاحب بے ہوش ہوگئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

لیکن یہ سلسلہ تو کئی ہفتوں سے سویرا کو نظر آرہا تھا۔ اس رات سویرا نہ سوسکی۔صبح ناشتا دونوں نے باہر لان میں کیا۔ چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔''آج کل آپ بڑے دل پھینک لگ رہے ہیں۔'' شاہ زمان ہنس دیا۔سلائس کا ٹکڑا منہ میں چباتے ہوئے بولا۔

''تم کس کی بات کررہی ہو؟'' وہ لانبی انگلی شاہ زمان کے پہلو میں گھساتے ہوئے بولی۔

''آپ کی ...... اور مجھے لگتا ہے آپ کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔'' اس کی انگلی رینگتی ہوئی شاہ زمان کے سینے پر آگئی۔

شاہ زمان نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور سویرا کا ہاتھ فوراً پرے ہٹادیا۔

''کیا ہوا......؟'' سویرا قہقہہ مارتے ہوئے شوخی سے ہنسی۔

''کیا کررہی ہو......کوئی دیکھ لے گا......'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''اچھاجی......آپ کو اپنی عزت کا بڑا خیال ہے۔'' اس نے شاہ زمان کے پہلو میں چٹکی لی پھر بولی۔''وہاں ڈنر

میں تو سب کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کررہے تھے آپ......ایک منٹ کے لیے بھی ماروی سے آپ کی نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔"

سویرا کی بات پر وہ دل کھول کر ہنسا...... بولا۔ "تم عورتیں بھی پتا نہیں کیا مخلوق ہو۔ ہر وقت شک کی دنیا میں جیتی ہو۔"

"تو کیا......شک نہ کروں......آپ برابر......اسے گھورے جارہے تھے۔" وہ مصنوعی خفگی سے لاڈ دکھاتے ہوئے بولی۔ وہ ادائیں دکھا رہی تھی......شاہ زمان کو چھیڑ رہی تھی مگر اندر اس کے دل میں اک گرہ سی لگ گئی تھی۔

شاہ زمان بولا۔ "تو شک نہ کیا کر...... چوڑیرو حویلی کے مردوں کے خون میں یہ چیز شامل ہے۔ ہم لوگ عورتوں کے قدرداں ہیں اور خاص طور پر خوبصورت عورتوں کے......تمہارے جیسی......" وہ اس کی طرف اشارہ کرکے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "اور ضروری نہیں ہے ہر خوبصورت عورت کو ہم اپنی بیوی بنالیں...... اسی لیے میں مفت مشورہ دیتا ہوں......تو ایویں شک کے بیج نہ بویا کر......" سویرا جانتی تھی کہ شاہ زمان نے یہ باتیں مذاق میں کی ہیں۔ وہ یہ باتیں کرتے ہوئے اشارے کنائیوں سے اسے چھیڑ بھی رہا تھا......مگر سویرا یہ بھی جانتی تھی کہ اس مذاق کی آڑ میں سچ بھی جھلک رہا تھا۔ شادی سے قبل اس نے اپنے ذہن میں جو اندیشے دبادیے تھے، وہ صرف دو تین ماہ بعد ہی سر اٹھانے لگے تھے۔

☆☆☆

دلاور کے ہاتھ میں عجیب شغل آگیا تھا۔ اس نے ظلفری سے اجازت لے لی تھی۔ وہ روزانہ سیبوں والے باغ کا رخ کرتا اور گھنٹوں اپنا من چاہا کھیل کھیلتا۔ تالاب کے پانی میں ڈبکی لگاتا تو دنیا کے رنج والم کچھ دیر کے لیے پانی سے باہر رہ جاتے...... ظلفری کسی کام سے تھوڑے دنوں کے لیے صادق آباد گیا ہوا تھا۔ دلاور کمرے میں اکیلا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتا تو سرکش سوچیں اس پر حاوی ہونے لگتی تھیں۔

باہر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا تھوڑی دیر میں بارش شروع ہوگی اور کئی مہینوں سے پیاسی زمین سیراب ہوجائے گی۔

جس سوچ اور جس جذبے کو سلانے کی سعی وہ پچھلے دو تین ماہ سے کررہا تھا اور جس میں وہ کچھ کامیاب بھی ہوا تھا، جاگ گیا۔ بدلتے موسم اور مست ہواؤں نے یکایک، اس کے اندر کا موسم بھی بدل ڈالا۔ شادی کے بعد اس نے دو تین دفعہ سویرا کو نئے ڈرائیور کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔ وہ سویرا کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پچھلے چند ہفتے سے اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ اب وہ یہ حرم چھوڑ جائے۔ مگر اب شاہ زمان نے اسے یہاں روک لیا تھا۔ وہ اس سے کوئی اہم کام لینا چاہتا تھا۔ وہ "اہم کام" کیا تھا، دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی دلاور کو معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ دلاور کے دل میں نشے کی مدہوشی کے عالم میں کئی دفعہ یہ سوال اٹھا تھا کہ سویرا کو ایک دفعہ بھی اس سے ملنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ چاہتی تو "بیمار" دلاور کی خبر لینے ہی آجاتی۔ مگر وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ سویرا اس کی خبر لینے ہی آئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں وہ کچھ دیکھ گئی تھی کہ دوبارہ وہاں آنے کی ہمت اس میں نہ رہی تھی۔

سہانے موسم نے آج اس کے دل کے تار چھیڑ دیے تھے۔ تھوڑی دیر بوندا باندی ہوتی رہی پھر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس نے اٹھ کے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سوندی گیلی مٹی والی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ جھوم اٹھا۔ سویرا شدت سے اسے یاد آنے لگی۔ اس کے نرم گلابی ہونٹ اب تک اسے بھولے نہیں تھے۔ اس نے ان ہونٹوں سے ایسا جام پیا تھا کہ مرتے دم تک اس نشے سے آزاد نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے بھولنے کی خاطر اس واقعے کو بے خبری کے پاتال میں پھینک دیا تھا مگر ایسے "حادثے" کب بھولتے ہیں۔ جب جب کلیاں کھلتی ہیں، جب جب بارش برستی ہے، اس واقعے کی یاد دل کی دیواروں کو ٹھوکریں مارتی ہے۔

باہر بارش برستی رہی اور وہ رات بہت دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ اس کی آنکھ نہ جانے کب لگی......مگر تھوڑی دیر میں ہی وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا......حواس کچھ بحال ہوئے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھ بستر پر کوئی اور بھی ہے۔ ایک نامانوس سی خوشبو بھی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس نے لائٹ آن کردی......خدا کی پناہ......اس کے بستر پر ایک قیامت موجود تھی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کا جوان قاتل جسم دلاور کے دماغ میں دھماکے کررہا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ مخمور نگاہوں سے دلاور کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کاجل لگی آنکھوں میں ایک داستان رقم تھی۔

دلاور نے اس فتنہ پرور لڑکی کو بے شمار دفعہ حویلی کے برآمدوں اور نشست گاہ کے آس پاس کام کرتے اور آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ وہی ماروی تھی جس کو حویلی کا ہر مرد للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لڑکی...... یہاں...... اس کے بستر پر رات کے ڈیڑھ، دو بجے کے قریب اس حالت اور ایسے موسم میں کیا کررہی تھی؟ دلاور کو سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ اس نے بڑی عجلت میں کمرے کا دروازہ کھولا، دھیمے مگر نہایت سخت لہجے میں بولا۔ ”چلو...... یہاں سے باہر نکلو......تم کیا کررہی ہو میرے کمرے میں؟“

اس نے نگاہ اٹھا کر ایک ادائے قاتلانہ سے دلاور کی جانب دیکھا۔ آہستگی سے بستر سے اٹھی۔ دلاور کے قریب آکر دروازہ بند کردیا۔ دلاور نے غصے کے عالم میں دروازہ کھولنا چاہا تو وہ شعلہ بدن پوری کی پوری دلاور کے ساتھ آلگی۔ دلاور ایک لمحے کے لیے سن ہوکر رہ گیا۔ رات، تنہائی، بارش اور ساتھ لگا ایک جوان نسوانی جسم...... دلاور جیسے سرتاپا پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے اس لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے علیحدہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی کاجل لگی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ سمجھ پاتا یا اس سے کوئی سوال کرتا، وہ بولی۔ ”دلاور! مجھے معاف کردینا۔ مجھے ایسا رستہ اختیار کرنا پڑا...... میں خود کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہاں تک پہنچی ہوں......“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ دلاور کا لہجہ درشت تھا۔

”میں تم سے پیار کرتی ہوں...... اور اس دن سے کرتی ہوں جس دن تم نے اس حویلی میں قدم رکھا ہے......“ وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر بولی۔ ”ٹھہرو، تمہیں یوں سمجھ نہیں آئے گی...... میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ یہاں آؤ...... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“

اس لڑکی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دلاور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی اور بولی۔ ”میرا نام ماروی ہے۔ ترنڈا کی رہنے والی ہوں۔ اس حویلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں جس لڑکے سے پیار کرتی تھی اس کا نام بابو تھا۔ اس کی شکل تم سے بہت ملتی تھی۔ تمہارے جتنا قد کاٹھ، تمہارے جیسا جسم۔ تین سال ہوئے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ختم ہوگیا۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ میں جھلی اور دیوانی ہوگئی۔ میں ہر روز اس کی یاد میں آنسو بہاتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے تمہیں حویلی میں دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا...... میں مجھی بابو لوٹ آیا ہے مگر دلاور جانے والے کب واپس لوٹ کے آتے ہیں۔ تم بابو نہیں ہو...... بابو جیسے تو ہونا...... روپے میں آٹھ دس آنے تو اس سے ملتے ہونا۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے بابو ابھی زندہ ہے۔ میرے پاس ہے۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اٹھ کر دلاور کو اپنی بانہوں میں لے لیا......

دلاور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا سر کسی گداز میں دھنستا چلا گیا...... نسوانی بدن کی خوشبو نے اس کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بہک جاتا...... اپنی ہی نظروں میں گر جاتا، اس نے خود کو ماروی سے علیحدہ کیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ماروی! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ میں صبح تم سے بات کروں گا۔“ دلاور نے لاکھ جتن کر کے اسے وہاں سے رخصت کیا اور واپس آکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ زمانے بھر کی خاک چھاننے والا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا دلاور اتنا تو سمجھ رہا تھا کہ ماروی خود سے یہاں نہیں آئی تھی، اسے کسی نے بھیجا ہے۔ کس نے بھیجا، یہ سوال جواب طلب تھا۔

ماروی نے جو کہانی اسے سنائی تھی، وہ نہایت کمزور اور بوگس تھی۔ کہانی سناتے ہوئے اس کے جذبات اور اس کا لہجہ میل نہیں کھا رہا تھا۔ وہ جیسے کسی کا یاد کرایا ہوا سبق پڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں ماروی اس کے لیے عجیب دردِ سر بن گئی۔ جب موقع ملتا وہ آن ٹپکتی اور پھر اس کی جان نہ چھوڑتی۔ وہ بہت دیر اس سے باتیں کرتی رہتی۔ صاف پتا چلتا تھا، وہ اسے خود کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر حربہ آزما رہی تھی۔

ایک دن وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا ڈیش بورڈ صاف کررہا تھا۔ آج وہ پہلے دن اپنی ڈرائیوری کی ڈیوٹی پر واپس آیا تھا۔ پستول اس نے اپنے ہولسٹر میں لگا رکھا تھا...... آگے جھک کر صفائی کرتے ہوئے پستول پسلیوں میں چبھنے لگا تو اس نے پستول نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب ماروی اگلا دروازہ کھول کے اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

”تم یہاں بھی پہنچ گئیں......؟“ دلاور نے اسے گھورا۔

”میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گی......“ وہ بالوں کی

ایک آوارہ لٹ کو انگلی پر گھماتے ہوئے بولی۔ جواب میں دلاور کچھ نہیں بولا، اپنے کام میں منہمک رہا...... ماروی نے ڈیش بورڈ سے پستول اٹھالیا، دلاور کی جانب کرتے ہوئے بولی۔

''اور اگر تم نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تو ...... میں تمہیں گولی ماردوں گی۔'' وہ ایک آنکھ بند کیے اس کا نشانہ لیے ہوئے تھی۔

دلاور نے جھپٹ کے اس سے پستول چھینا تو وہ ایک دم سہم گئی...... دلاور نے اسے بے نقط سناڈالیں...... پہلے وہ خاموش ہوئی پھر چہرے کے تیور بگڑے۔ نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر کجلی آنکھوں میں آنسو لے آئی...... اس نے تیزی سے اس سے پستول چھینا تھا اسی دوران اس کے ناخنوں سے ماروی کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا۔ دلاور کا دل نرم پڑ گیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا...... اسی دوران شاہ زمان اندر سے برآمد ہوا۔ اس کا دھیان گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھی ماروی پر پڑا۔ ماروی نے چونک کر دلاور سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گاڑی سے نکل کر سر پر دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ شاہ زمان نے جاتی ہوئی ماروی کو بڑی گہری اور تفصیلی نظروں سے دیکھا اور گاڑی کی طرف آ گیا۔ دلاور نے بڑی سرعت سے شاہ زمان کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا...... شاہ زمان بڑے کروفر سے گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی تیزی سے حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ خاموشی کے گزر گئے پھر شاہ زمان کی بھاری آواز گونجی۔

''اب تم کیسے ہو......؟''

''اللہ کا کرم ہے بڑے سائیں...... پہلے سے بہت بہتر ہوں......''

''اسپتال سے جو رپورٹس آنی تھیں، ان کا کیا بنا......''

''بڑے سائیں...... رپورٹس آ گئی تھیں۔ اللہ کا کرم ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' رپورٹس کے بارے میں دلاور نے جھوٹ سے کام لیا تھا اور اس جھوٹ کا مشورہ بھی دلاور کو ملتانی نے ہی دیا تھا۔ نہ ہی کوئی ٹیسٹ ہوا تھا، نہ ہی کسی رپورٹس نے آنا تھا مگر حویلی میں یہی مشہور کیا گیا تھا کہ ملتانی، دلاور کی بیماری سے متعلق خون کے ٹیسٹ لے کر گیا ہوا ہے۔

چند لمحے پھر خاموشی سے گزر گئے پھر شاہ زمان نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کُڑی'' تمہاری گاڑی میں کیا کررہی تھی؟

دلاور گڑبڑا گیا۔ ''کون سی کُڑی...... بڑے سائیں......''

شاہ زمان کا لہجہ قدرے ترش ہوگیا۔ ''اوئے...... وہی...... جو میرے آنے پر گاڑی سے نکل کر بھاگی تھی۔''

''بڑے سائیں! میں تو اسے ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔ تھوڑے دن سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں تو اب تنگ آ گیا ہوں۔'' شاہ زمان پُرسوچ انداز میں عقب نما شیشے میں دلاور کو دیکھنے لگا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''وہ تمہاری گاڑی میں کیا کررہی تھی؟ تم نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ رکھا تھا۔''

''بڑے سائیں! کیا بتاؤں...... یہ لڑکی جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ فلمی باتیں کرتی ہے۔ کہتی ہے تمہاری شکل میرے بابو سے ملتی جلتی ہے۔ بابو کو اپنا منگیتر بتاتی ہے جو تین سال پہلے کسی ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ اب بھی میں گاڑی کا ڈیش بورڈ صاف کررہا تھا کہ میری بے خبری میں اندر گھس آئی۔ میں نے اپنا پستول ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر میری طرف اس کا رخ کردیا اور فضول ایکٹنگ کرنے لگی۔ میں گھبرا گیا جھپٹ کر اس سے پستول چھینا تو میرے ناخن اس کے ہاتھ پر نشان چھوڑ گئے۔ خون رسنے لگا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اوپر سے آپ آ گئے۔'' دلاور نے سب صاف صاف بیان کردیا۔

شاہ زمان بڑی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا گیا اور سوچتا چلا گیا۔ جانے کیوں دلاور کو محسوس ہورہا تھا کہ شاہ زمان کا دل ماروی پر آیا ہوا ہے۔

☆☆☆

سویرا نے اپنے ہاتھوں سے شاہ زمان کے لیے دودھ کی باداموں والی سردائی بنائی تھی۔ وہ شام سے ہی اس کا انتظار کررہی تھی مگر شاہ زمان رات گئے دلاور کے ساتھ واپس آیا۔ آرام گاہ میں پہنچا تو کافی تھکا ہوا دکھتا تھا۔ سویرا نے آگے بڑھ کر اس کی واسکٹ اتاری...... بستر پر بیٹھا تو اس کے جوتے اتار کر جرابیں اتارنے لگی۔

''لگتا ہے، آج آپ بہت تھک گئے ہیں......''

شاہ زمان جواباً کچھ نہیں بولا۔ بیڈ پر بیٹھ کر سر پیچھے ٹکا دیا۔ سویرا نے ٹھنڈی سردائی گلاس میں انڈیلی اور شاہ زمان کو پیش کردی، بولی۔ ''میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

شاہ زمان تین گھونٹوں میں ساری سردائی اندر انڈیل گیا۔

''آپ کچھ پریشان دکھتے ہیں۔'' سویرا فکرمندی سے بولی تو شاہ زمان سیدھا ہوکر بیٹھا اور بولا۔

''میں پریشان ہوں تمہیں اس سے کیا...... تم کھیل

السلام علیکم

ہمیں اپنے نئے بلاگ (ویب سائیٹ) کے لئے رائٹرز کی
ضرورت ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی ممبر ناول، افسانہ،
ناولٹ لکھنا چاہے تو ہم سے کانٹیکٹ کر سکتے ہیں۔ اپنی تحریر
اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی
کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتہ کے
اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ہمیں
ای۔میل کریں یا ان بکس میں میسج کریں۔

شکریہ

Email Address: - aatish2kx@gmail.com

کھیلوا بچے......"

سویرا دم بخود رہ گئی۔ پریشانی سے اس کا چہرہ کھنچ گیا۔ وہ بمشکل بولی۔ "کیا...... کھیل کھیلا ہے...... میں نے......؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو...... حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ کیسی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں۔"

"میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی...... میں نے کونسا جرم کیا ہے جس کی خبر مجھے بھی نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"وقت آنے پر سب معلوم پڑ جائے گا...... ابھی مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال مت پوچھو۔"

"مگر...... میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

شاہ زمان سویرا کی بات کاٹ کر بہت زور سے دھاڑا اتنی زور سے کہ سویرا کو کمرے کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ "میں نے ایک بار کہا نا...... اس بارے میں مجھ سے ابھی کوئی سوال مت پوچھو......"

سویرا سہم گئی...... خاموش ہو گئی...... سندھ یونیورسٹی میں کلاس فیلوز کے ساتھ چہلیں کرنے والی، رومانوی شاعری کرنے والی...... بات بے بات قہقہے لگانے والی سویرا خاموش ہو گئی...... عورت کو اپنا گھر بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا...... اس کا ناتواں دل لحہ بہ لحہ لرزتا ہے، پل پل وہ ڈر جاتی ہے، سہم جاتی ہے۔

سویرا کی وہ رات خاموشی میں آنسو بہاتے ہوئے گزر گئی...... صبح ناشتے میں بھی شاہ زمان کا رویّہ سویرا سے ٹھیک نہیں رہا...... وہ آدھا ناشتا کر کے باغیچے میں چلا گیا لنگڑاتے ہوئے حویلی کا چکر کاٹا...... شاہ فرمان سے نشست گاہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا طویل گفتگو کی...... پھر گیارہ ساڑھے گیارہ کے قریب باغیچے میں واپس آ گیا۔ اس نے ایک ملازمہ کو ماروی کو بلانے کے لیے بھیجا...... تھوڑی دیر بعد ماروی سکڑی سمٹی اس کے روبرو تھی۔

"سر میں تیل کی مالش کر لیتی ہو......" شاہ زمان سخت لہجے میں بولا۔

"جج...... جی بڑے سائیں......" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"تو جاؤ پھر تیل لے آؤ۔"

ماروی دوڑی ہوئی گئی اور دو منٹ میں واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی بڑی بوتل تھی۔ اس نے احتیاط سے سر میں تیل ڈالا اور مالش کرنے لگی۔

شاہ زمان کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔ وہ تنی گردن کے ساتھ بڑے کروفر سے کرسی پر بیٹھا مالش کروا رہا تھا۔ عادت سے مجبور مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "کیا نام بتایا تھا تیری ماں نے اپنے گاؤں کا؟"

"بڑے سائیں...... ترنڈا......"

"تیرا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"بڑے سائیں! ہم لوگ ٹھوری ہیں۔ میرا باپ بکریاں چراتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی چنی گوٹھ ہے...... وہ وہاں منڈی میں ہوتا ہے۔"

"تو کل...... گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟" اچانک شاہ زمان نے سوال کیا تو ماروی یکدم سے گڑبڑا گئی۔ لرزتے لہجے میں بولی۔

"وہ...... وہ بڑے سائیں...... مم...... میں...... مم...... میں......"

"کیا میں...... میں لگائی ہوئی ہے...... ٹھیک سے جواب دے۔" شاہ زمان کا لہجہ سخت ہو گیا۔ وہ ماروی کے ہاتھ کی انگلیاں بری طرح مروڑ رہا تھا۔

"وہ جی...... بی بی جی...... نے مجھے بھیجا تھا......" کانپتی آواز میں اس نے کہا۔

"کس کام کے لیے؟" لہجہ بدستور تلخ تھا۔

ماروی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا جواب دے پھر ایک دم سے بولی۔ "بازار سے کچھ سامان منگوانا تھا جی۔" تکلیف کے سبب اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

شاہ زمان سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس نے ماروی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے بولا۔ "اچھا...... اب تو جا۔" شاہ زمان نے دور سے آتی بڑی آپا کو دیکھ لیا تھا۔

بڑی آپا مسکراتے ہوئے شاہ زمان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں، بولیں۔ "میرے چھوٹے ویر کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا آج کل......"

"میں بالکل ٹھیک ہوں بڑی آپا......" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"تیرا پیر کیسا ہے......؟ زخم پورا بھر گیا ہے نا......"

"ہاں...... ہاں بڑی آپا...... اب تو پیر پر پورا وزن پڑتا ہے۔"

"وہ باز والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" بڑی آپا حویلی کے حالات سے آگاہی رکھتی تھیں اور کسی حد تک [illegible] معاملات میں انوالو بھی رہتی تھیں۔

"بڑی آپا...... وہ باز ہماری سوچ سے بھی [illegible] ہے۔" شاہ زمان کی آنکھوں میں [illegible]

"تمہارے خیال سے [illegible]"

"بڑی آپا! آپ کو [illegible]"

شنخوں کے درمیان لڑائی کی وجہ بنا ہوا ہے۔"

"ہاں...... مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا چلا تھا......"

"شنخوں کی وہ لڑائی عروج پکڑ گئی ہے۔ وہ اب ایک ضد اور انا بن گئی ہے۔ مڈل ایسٹ پاکستان نہیں ہے جہاں ڈنڈے کے زور پر...... دھونس...... دھاندلی سے کوئی چیز حاصل کر لی جائے...... وہاں پر یہ سب چیزیں نہیں ہوتیں...... دونوں شیخ یہ سب دنگا فساد نہیں کر سکتے مگر...... جو وہ کر سکتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کر رہے ہیں۔ سننے میں یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ شان نامی باز کی بولی ستر سے اسی لاکھ ریال تک لگ گئی ہے۔"

بڑی آپا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولیں۔ "ستر...... اسی لاکھ ریال...... یہ...... کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے...... یہ خبر جھوٹی ہو...... یا بڑھا چڑھا کر بتائی گئی ہو...... مگر بڑی آپا...... اس میں ایسی کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ یہ شیخ اپنے عیش و آرام اور کبھی کبھی تفریح طبع کے لیے لاکھوں ریال خرچ کر دیتے ہیں...... تو جہاں...... ضد اور انا کا مسئلہ پیدا ہو جائے...... وہ......" شاہ زمان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بڑی آپا کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی...... شاہ زمان سے تھوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ "وہ باز...... اب ہے...... کہاں......؟"

شاہ زمان آہستگی سے بولا۔ "بڑی آپا...... وہ ہمارے کنٹرول میں ہے۔ حضور جانڈیو اور شوکت سیال کے حویلی پر کیے جانے والے حملے کے بعد...... وہ باز ہم نے یہاں سے ترنڈا بھیج دیا ہے۔ تھوڑے دن پہلے جو میں ترنڈا گیا تھا...... اسی سلسلے میں گیا تھا۔ سفید حویلی کے تہ خانے میں "شان" اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ چار گارڈ اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

"مگر...... شوکت سیال......؟" بڑی آپا نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"حویلی پر ہلا بول کے انہوں نے جو غلطی کی ہے، ان کی جان اتنی جلدی نہیں چھوٹے گی۔ ابھی بھی میں بھائی جی سے اسی کیس کے بارے میں بات کر کے آیا ہوں...... حویلی پر حملے کے بعد جو پرچہ ہم نے کٹوایا تھا، اس میں ہم نے ایک قتل بھی شوکت سیال پارٹی پر ڈال دیا تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے شوکت سیال کی پشت پناہی کرنے والا حضور جانڈیو ہے۔ الیکشن سر پر ہیں۔ فی الحال حضور جانڈیو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کی پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ وہ تو حویلی پر کیے جانے والے حملے پر بھی پچھتا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ اس کے تربیت یافتہ کارندے گوریلا ایکشن کر کے بڑی صفائی سے باز اڑا لے جائیں گے...... اور کسی کو خبر بھی نہ ہو گی مگر ہمارے بندوں نے نا صرف بیرونی خطرے پر آنکھیں کھلی رکھیں بلکہ حملہ آوروں کو بھرپور جواب بھی دیا۔ حضور جانڈیو کی سازش بے نقاب ہو گئی۔ اس کو لینے کے دینے پڑ گئے...... اب وہ کیس ختم کرانا چاہ رہا ہے اور ہم لوگ کیس کو طول دے رہے ہیں۔"

بڑی آپا معنی خیز انداز میں مسکرائیں، بولیں۔ "اس کا مطلب ہے تم لوگ وہ باز واپس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"نہیں بڑی آپا...... ہم نے کیا باز کا اچار ڈالنا ہے۔ باز تو ہم حضور جانڈیو پارٹی کو واپس کریں گے مگر کڑی شرائط پر......"

"مگر مجھے تو کچھ ایسی خبر پہنچی تھی کہ وہ باز تمہارے "بھائی جی" نے شیرو کے ذریعے چوری کروایا تھا۔"

شاہ زمان آنکھ میچ کے بولا۔ "بڑی آپا...... یہ چوڑیر و حویلی کی سب سے خفیہ خبر ہے...... کہتے ہیں دیواروں کے کان بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے خاموشی بہتر ہے......" وہ کرسی پر سیدھا ہوا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "وہ باز بھائی جی نے شیرو کے ذریعے ہی حاصل کیا ہے مگر عدالت میں...... شیرو نے پیش ہو کر اپنا بیان ریکارڈ کروایا ہے کہ وہ باز اس نے رحیم یار خان کے قریب "ست یار" گوٹھ سے رانا قوم کے ایک بندے "سخی بابر" سے خریدا ہے۔"

"اور عدالت نے یہ سب سچ مان لیا......؟"

"اور کیا تو نہیں...... عدالت کو سچ ماننا پڑا......" شاہ زمان زیر لب مسکرایا...... بڑی آپا کا سوالیہ انداز دیکھ کے بولا۔ "ہم نے سخی بابر کو عدالت میں پیش کر دیا اور اس نے اقبالی بیان میں صاف کہہ دیا کہ یہ باز اس نے شیرو کو فروخت کیا تھا۔"

"یہ سب کیسے ممکن ہے......؟" بڑی آپا کی حیرت عروج پر تھی۔

شاہ زمان نے ایک قہقہہ لگایا، بولا۔ "بڑی آپا...... روپیہ...... یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے آپ خوشیاں خرید سکتے ہو...... خواہشیں خرید سکتے ہو...... ایمان خرید سکتے ہو...... لوگ خرید سکتے ہو...... آپ کا کیا خیال ہے؟ سیاسی پارٹیوں کے آگے آگے چلنے والے

...... گلا پھاڑ کر نعرے لگانے والے لوگ اپنے لیڈروں کے ساتھ ہوتے ہیں...... نہیں...... نہیں...... وہ نامراد روپیہ ہوتا ہے جو انہیں ناچنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"سخی بابر کے بیان سے تو حضور چانڈیو پارٹی بری طرح پھنس جائے گی......" بڑی آپا نے کہا۔

"پھنس جائے گی کیا...... پھنس گئی ہے...... اب وہ دن دور نہیں جب شوکت سیال اور حضور چانڈیو گھٹنے ٹیکتے ہوئے چوڈیرو حویلی آئیں گے...... کیس ختم کرانے اور باز کی واپسی کے لیے ہمارے ترلے کرنے......!"

بڑی آپا خاموش تھیں۔

☆☆☆

وہ نیم دراز تھی اور سوچوں کے پنچھی پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ دور ریگستان کے بیابانوں سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور پورے ماحول پر چھا جاتی تھی یا شاید یہ ہوک اس کے اپنے من میں کرلاتی تھی۔ جس دن سے وہ دلاور کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے لکڑی کے بکس میں پڑی ہوئی وہ چیزیں دیکھی تھیں، اک احساس جرم نے اسے گھیر لیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی سوچ اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی، کہیں اس کی بے وقوفی نے کسی کی زندگی عذاب تو نہیں بنا دی تھی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رخساروں کے پاس کسی چیز کا احساس جاگا۔ اس نے انگلی سے چھوا تو حیران رہ گئی...... وہ آنسو تھے جو بنا دستک دیے اس کی آنکھوں سے پھسل آئے تھے۔ آنسو تو کسی جذبے، کسی دکھ کے ساتھ آنکھوں سے چھلکتے ہیں مگر یہ کیا ہوا تھا؟ اسے خود کو بھی پتا نہ چلا تھا اور اسے پتا بھی کیسے چل سکتا تھا...... یہ آنسو بالکل اس کی لاعلم محبت کی طرح غیر محسوس تھے جو اس کے وجود میں کسی ہلکی سی چنگاری کی صورت پنپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ماروی اندر داخل ہوگئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" سویرا ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی...... "تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟"

"بی بی جی! مجھے لگتا ہے بڑے سائیں کو شک پڑ گیا ہے۔" وہ ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... انہوں نے تجھ سے کچھ کہا؟" سویرا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"میں اس دن دلاور کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ بڑے سائیں نے مجھے دیکھ لیا...... بڑی غصے والی نظروں سے گھور رہے تھے جی مجھے۔"

"انہوں نے تجھ سے کوئی بات کی......؟"

"بات وات تو نہیں کی جی...... پر اگلے دن مجھ سے کہنے لگے میرے سر میں تیل کی مالش کر دو۔"

"تو پھر......" سویرا کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میں نے کر دی مالش...... مالش کرواتے ہوئے غصے سے پوچھنے لگے...... اس دن تو گڈی میں دلاور کے ساتھ کیا کر رہی تھی...... میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں بی بی جی...... مجھے سمجھ نہ آئی کیا جواب دوں، پھر میں نے بہانہ بنایا کہ بی بی جی نے مجھے بھیجا تھا...... بازار سے کچھ چیزیں منگوانی تھیں۔"

"آگے سے کیا بولے تمہارے بڑے سائیں۔"

"بولے وولے کچھ نہیں...... غصے سے مونچھوں کو تاؤ دیتے رہے اور بڑی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔" سویرا کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے شاہ زمان کا اس دن والا رویہ یاد آنے لگا۔ "تم کھیلو...... کھیل اپنے...... تم اچھی طرح جانتی ہو حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں......"

تو کیا شاہ زمان باخبر ہو چکا تھا؟

اس نے ماروی کو جانے کا کہا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نیم دراز ہوگئی...... شاہ زمان نے کہا تھا۔ "تم کھیلو کھیل اپنے......" ہاں تو وہ کھیل رہی تھی...... یہ کھیل...... کیونکہ وہ ایک کمزور عورت تھی

وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی...... شاہ زمان کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتی تھی...... شاہ زمان جن نظروں سے ماروی کی جانب دیکھتا تھا...... وہ نظریں یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی تھیں کہ...... بہت جلدی نہ سہی، دیر سے ہی سہی...... شاہ زمان ماروی سے "ہر طرح" کے تعلقات استوار کر لے گا...... اور "ضرورت" پیش آنے پر اس سے بیاہ بھی رچا لے گا...... ماروی عام لڑکی ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور قیامت ڈھاتے جسمانی نشیب و فراز کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زمان کا "ایمان" خراب ہو جاتا...... سویرا ماروی کو دلاور کے ساتھ نتھی کر دینا چاہتی تھی۔

سویرا نے ہی ماروی کو اعتماد میں لے کر دلاور کے پیچھے لگایا تھا۔ ایک طرف وہ ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی...... دوسری طرف ناسمجھی میں جو غلطی اس سے ہوئی تھی، وہ اس کا مداوا کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دلاور...... ماروی کی طرف مائل ہو جائے اور دل میں پلنے

والے منفی جذبوں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ وہ جذبے جن کا تعلق خود سویرا سے تھا۔ کچھ چیزیں پس منظر میں ہوتی ہیں، نظر نہیں آتیں۔ کچھ قیامتیں سمندر کی گہرائی میں ہوتی ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ سویرا، ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ دلاور کے قریب لانا چاہتی تھی۔ بظاہر تو وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔ مگر اس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹی سی "ندی" بھی بہتی تھی اور اس ندی کے پانی سے جیسے آواز آتی تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
رہ رہ کے سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

☆☆☆

وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ ماروی کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے۔ جس دن سے اس نے بڑے سائیں کے ساتھ ماروی والی بات کی تھی۔ اس دن سے ماروی کی پیش قدمی سست ہو گئی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں رہتی تھی۔ جب بڑے سائیں حویلی میں نہیں ہوتے تھے، وہ چھم سے دلاور کے روبرو آن کھڑی ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ سیبوں والے باغ کی طرف سے چلا آ رہا تھا کہ وہ اچانک اس کے سامنے آ گئی۔ دلاور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس نے لمبے بالوں کی چٹیا میں گجرے لگا رکھے تھے۔ ایک ادا سے دلاور کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم بڑے ظالم ہو......"

"میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا۔ میں ظالم کہاں سے ہو گیا؟"

"اسی وجہ سے تو تجھے ظالم کہہ رہی ہوں۔ تو مجھے کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔" وہ ادا سے لہراتے ہوئے بولی۔

"کیا کہوں تجھے؟" دلاور آج دل لگی کے موڈ میں تھا۔

"میری طرف غور سے دیکھ...... میرے حسن کی تعریف کر...... میرے بارے میں کچھ کہہ...... حویلی کا کون سا ایسا مرد ہے جو میرے حسن کی تعریف نہ کرتا ہو...... بس ایک تو ہے جو پتا نہیں کس خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ ایسا ٹھنڈا مرد میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تو آج سچ سچ بتا میرے سے چاہتی کیا ہے؟"

"سنے گا...... تو تڑپ جائے گا......"

"میں تڑپنا چاہتا ہوں"

"تو سن......" وہ ایک لمحے کے لیے رکی [illegible] دلاور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بولی۔ "میں تجھ سے محبت کرتی ہوں...... تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں"

دلاور نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی، یہ نمی جھوٹی تھی یا سچی۔ اس سے دلاور کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو اس جہان کا باسی بن گیا تھا...... جہاں کسی بھی چیز سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ عشق کے ایسے دریاؤں کو عبور کر رہا تھا جن میں آگ بھی تھی اور ان دریاؤں کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا بھی تھا۔ دلاور نے جیسے سویرا کے عشق میں ڈوب کر "فنا" حاصل کر لی تھی۔

دلاور نے ماروی کی طرف دیکھ کر بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "ماروی! تم بہت اچھی...... ہو...... خوبصورت اور جوان بھی ہو...... ہو سکتا تھا بلکہ یقیناً میں تمہاری طرف مائل ہو جاتا۔ اگر میرے ساتھ ایک بدقسمتی نہ ہوئی ہوتی۔"

"کیسی بدقسمتی......؟" ماروی نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"میں برف کا آدمی ہوں...... میرے دل میں پہاڑوں کی سینکڑوں ٹن برف نے بسیرا کر رکھا ہے۔ میرے جذبات کوہ ہمالیہ کی برف کی چادر اوڑھ کر سو چکے ہیں۔"

ماروی کانپ گئی، بولی۔ "تمہاری کوئی بات بھی میرے پلے نہیں پڑ رہی......" وہ پاس پڑے سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔

دلاور بولا۔ "تمہارے پلے پڑ بھی نہیں سکتی...... سنو...... میں تمہیں ایک بات بتاؤں...... تمہیں پتا ہے ایک جیتا جاگتا انسان...... ایک چلتی پھرتی لاش میں کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ جب اس سے جینے کا مطلب چھین لیا جاتا ہے۔"

...... ماروی گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھنے لگی...... اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی دلاور کو یوں بولتے ہوئے نہ دیکھ لے...... مگر یہ دوپہر کا وقت تھا...... جھلسا دینے والی چولستانی ہوا حویلی کے اس حصے میں دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور جس سنگی بینچ پر ماروی بیٹھی تھی اس کے اوپر نیم کے دو جڑواں درختوں نے چھاؤں کیے ہوئے تھے۔

دلاور کہہ رہا تھا۔ "ماروی...... میں آج [illegible] ہوں...... میں پاکستان کے ہر شہر میں رہا ہوں...... جہاں [illegible] دل اچاٹ ہو جائے بھاگ نکلتا ہوں...... میں یہاں [illegible] بھاگ جانا چاہتا ہوں مگر بڑے سائیں [illegible] ہے...... لیکن شاید...... نہیں...... بڑے [illegible] بھی اتنی طاقت نہیں ہے [illegible] ماروی...... میں یہاں سے [illegible]

......مگر بڑی بڑی فولادی بیڑیاں ہیں جو میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھاگتا ہوں اور منہ کے بل گر جاتا ہوں۔ پھر اٹھ کے دوبارہ کوشش کرتا ہوں پھر گر پڑتا ہوں۔ میری ٹانگیں زخمی ہو چکی ہیں، میرا سارا جسم چھلنی ہو چکا ہے...... ماروی...... تم نے کبھی ایسا پرندہ دیکھا ہے جو آگ میں جل رہا ہو...... وہ اڑنا چاہے تو نہ اڑ پائے...... اور نہ ہی موت سے اس کی خلاصی ہو......'' دلاور ہذیانی انداز میں بول رہا تھا اور آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

ماروی کے جسم میں واضح کپکپی طاری ہو چکی تھی...... اس کا وہاں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی بہانہ بنایا اور وہاں سے بھاگ نکلی......

☆☆☆

اس دن کے بعد ماروی نے دلاور کے پاس جانا کم کر دیا۔ سویرا نے وجہ پوچھی تو ماروی نے صاف کہہ دیا۔ ''بی بی جی...... میں نے ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہ بندہ ٹوس سے مس نہیں ہوتا...... کسی عجیب مٹی کا بنا ہوا ہے بلکہ اب تو مجھے اس سے خوف آنے لگا ہے۔ بڑی اول جلول سی باتیں کرتا ہے جی وہ......''

''کیا کہتا ہے......؟'' سویرا کے لہجے میں تجسس تھا۔

''وہ...... جی...... پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا ہے۔ کبھی عشق کی...... کبھی برف کی...... کبھی کہتا ہے تم نے زندہ لاش چلتی پھرتی دیکھی ہے۔ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑتا بی بی جی......''

سویرا کی آنکھوں میں دکھ گہرا ہو گیا...... انگلی میں پڑی انگوٹھی کو مروڑتے ہوئے بولی۔ ''اور کیا کہتا تھا......؟''

''کہتا ہے میں برف کا آدمی ہوں...... اس کی باتیں سن کر تو میں کانپ گئی تھی...... بی بی جی آپ...... یہ کام اور کسی کو دے دیں۔ دلاور بڑا اور ٹائپ کا بندہ ہے۔۔۔ پتا نہیں کن چکروں میں ہے......''

حویلی کا ہر مرد اسے یوں دیکھتا تھا کہ ابھی کھا جائے گا۔ ان مردوں میں سویرا کا خاوند سرفہرست تھا اور کیوں نہ ہوتا...... وہ اس حویلی کا بڑا سائیں تھا۔ اس سے زیادہ حق ماروی پر کسی کا نہیں بنتا تھا۔ وہ اسے نوچ کر بھی کھا جاتا تو کسی کی مجال نہیں تھی۔ سویرا کا دل کوئی ہتھیلی میں لے کر مسلنے لگا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا کہ ایک بھی نہ کر سکے گی۔

☆☆☆

دلاور اکثر شاہ زمان یا پیر فضل کی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ ''بیماری'' سے ٹھیک ہونے کے بعد یہ ڈیوٹی اس نے خود بڑے سائیں سے سفارش کر کے لگوائی تھی۔ وہ سویرا کی گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر عجیب بات تھی کہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ ماروی اب بھی وقتاً فوقتاً اس سے ملنے آتی تھی مگر وہ بھی جان چکی تھی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ مجبوراً سویرا بی بی کے کہنے پر اسے یہ ڈیوٹی بہرحال دینی تھی۔ حضور چانڈیو سے کیس زور و شور سے چل رہا تھا جس میں شاہ زمان کا پلڑا بھاری تھا۔ ''شان نامی باز'' ترنڈا میں سفید حویلی کے تہ خانے میں بالکل محفوظ تھا۔ وہ ایک بلینک چیک تھا۔ شاہ فرمان کی غیر قانونی اسمگلنگ جاری تھی۔ ایک دو بار اس نے سوچا کہ اس شان نامی باز کے سلسلے میں دونوں شیخوں سے خود سودا کیا جائے مگر ایسا کرنے سے اسے شاہ زمان اور پیر فضل نے باز رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

شاہ زمان کا ماروی سے آنکھ مٹکا مسلسل جاری تھا۔ یہ سویرا اور شاہ زمان کے درمیان ایک سرد جنگ تھی۔ سویرا ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنے کے لیے جو کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی...... جبکہ شاہ زمان ماروی سے قربت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

ملتانی دو چار دفعہ دلاور سے ملنے حویلی آیا تھا پھر واپس پنڈی چلا گیا تھا۔

دلاور کا کئی دفعہ سویرا سے آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ کسی بہانے سے کترا کر گزر جاتا تھا۔ اس کے دل کا حبس جب حد سے بڑھ جاتا تھا تو وہ رات کے وقت روہی کی طرف نکل جاتا تھا۔ ظفری اسے اکثر منع کرتا کہ رات کے وقت جھاڑیوں اور کیکر کی جڑوں میں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ پر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ شیشے کی بلند دیواروں کے اندر کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رات کے وقت اکثر چلتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ کیکٹس کے پودوں سے بچتا بچاتا۔ کیکر کے درختوں سے ہمکلام ہوتا وہ ایک ریتیلے ٹیلے سے پار ایک پستہ قد بیری کے نیچے جا بیٹھتا۔ یہ جگہ اس کی جائے پناہ تھی۔ اس سے آگے روہی کی بے آب و گیاہ بیکراں وسعتیں تھیں۔ جہاں اجنبی سناٹے ''بستے'' تھے۔ اجنبی سناٹے جو اس کا پہلا عشق تھے۔ ان سناٹوں اور سویرا کے عشق میں کتنی مماثلت تھی۔ سویرا کا عشق بھی پہلے عشق کی طرح خاموش، پراسرار اور جان لیوا تھا۔

آج بھی وہ پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ شاہ زمان کسی کام کے سلسلے میں تھوڑے دنوں کے لیے کراچی گیا ہوا تھا...... حویلی کی عورتوں کا ڈرائیور بیوی کی زچگی کی وجہ سے چھٹی پر تھا اور شاہ زمان جاتے ہوئے دلاور کی ڈیوٹی زنان خانے کی ڈرائیونگ پر لگا گیا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر کوئی بہانہ نہ چل سکا تھا۔

دلاور بہت رات تک پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا...... سویرا کی ایک ایک بات اس کی سماعت میں گونجنے لگی...... اس کی ہر ہر حرکت...... ہر ہر ادا...... گلابی ہونٹ تھے جن کے گداز میں اس کا دل دھنستا چلا جا رہا تھا۔ یہ صرف نرم و نازک ہونٹ نہیں تھے، ایک دلدل تھی جس میں وہ ناک تک ڈوب چکا تھا۔ ہاتھ پیر منجمد تھے...... پورا جسم مفلوج تھا۔ صرف ناک سے سانس کی آمدورفت جاری تھی۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ سانس اندر کھینچنے سے پورے جسم میں درد جاگ اٹھتا تھا۔

یکا یک اس نے تیز تیز سانس کھینچنا شروع کر دیے۔ دلدل اسے نگل رہی تھی۔ وہ اچانک اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز دور بیابانوں تک سفر کرتی چلی گئی۔ انجانی سناٹوں تک پھیلتی چلی گئی...... اس نے گھبرا کر بیری کی ایک شاخ تھام لی...... یہ کانٹوں والی بیری تھی۔ کئی کانٹے اس کی ہتھیلی اور انگلیوں میں پیوست ہو گئے...... ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ریت کے اس سے ریت کے کئی ذرّے اس کی نمناک آنکھوں میں گھس گئے...... مرد تھا...... رونا نہیں چاہتا تھا...... مگر ریت کے ذرّوں نے ایک جواز پیدا کر دیا تھا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں، اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے......

☆☆☆

پچھلی رات بہت دیر تک وہ روہی میں رہا تھا۔ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی بھی وقت وہ امتحان شروع ہوسکتا ہے جس سے وہ اتنے عرصے سے نظریں چراتا آیا ہے...... دلاور کے عشق کی کہانی بھی کتنی عجیب و غریب تھی۔ وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا...... مگر حویلی چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سویرا کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو میں معطر بھی رہنا چاہتا تھا۔ شاید بلند شیشے کی دیواروں کے اندر کے تقاضے اور تھے...... شیشے کی دیواروں سے باہر نکل آیا تھا۔

جس امتحان سے وہ ڈر رہا تھا، اگلی صبح ہی وہ شروع ہوگیا...... وہ کیپ پہنے گاڑی میں بیٹھا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا کہ اچانک پچھلا دروازہ کھلا اور خوشبو کا ایک جھونکا گاڑی میں داخل ہوگیا۔ یہ وہ خاص مہک تھی جو دلاور مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ دلربا مہک تب پہلی مرتبہ اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی جب ڈوبتی سویرا کو اس نے لا کر تالاب کے کنارے لٹایا تھا اور یہ خوشبو اس وقت تیز تر ہوگئی تھی جب...... اس نے اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر ثبت کیے تھے۔

ہاں، وہ سویرا ہی تھی جو دوپٹا گلے میں ڈالے، بال لہراتی گاڑی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ سر جھکا کر ہینڈ بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس کے کھلے بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا...... وہ دلاور کی موجودگی سے لاعلم بولی۔ ''اسلم! جلدی چلو...... مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔'' اسلم اس ڈرائیور کا نام تھا جو چھٹی پر گیا ہوا تھا۔

''بی بی جی! کون سی یونیورسٹی......؟'' دلاور دھیمی آواز میں بولا تو جیسے سویرا ایک جھٹکے سے کسی خواب سے بیدار ہوگئی...... اس کی نسواری بالوں کی لٹیں گالوں پر جھول رہی تھیں اور حیرت سے دہن تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ ادا نہیں تھی، فطری تاثر تھا...... مگر یہ تاثر قیامت ڈھا رہا تھا...... دلاور نے ایک لمحے کے لیے یہ قیامت دیکھی تھی اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

''دلاور...... تم......؟''

''جی بی بی جی......!''

سویرا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا پھر وہ خود کو اعتدال پر لاتے ہوئے بولی۔ ''بہاولپور یونیورسٹی جانا ہے۔ رستہ معلوم ہے تمہیں......؟''

''بہت عرصہ پہلے آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ کچھ یاد ہے۔''

''دوسرا ڈرائیور اسلم کدھر ہے......؟''

''میرا خیال ہے وہ چھٹی پر ہے۔ بڑے سائیں نے اس کی جگہ میری ڈیوٹی لگائی تھی۔''

''اچھا پھر چلو...... جو رستہ یاد ہے اس پر چلتے جاؤ...... بھول جاؤ گے تو میں بتا دوں گی۔'' دلاور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سویرا اور دلاور معاشرتی تفاوت کے باوجود بھی اچھے دوست تھے مگر وقت نے دراڑ

ایک جھجک پیدا کر دی تھی دونوں کے بیچ...... دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد بالآخر وہ جھجک سویرا نے ہی دور کی۔
وہ ونڈ اسکرین سے پار کھلے بے آباد میدانوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں معلوم ہے، میں تم سے سخت خفا ہوں۔''
دلاور کا تاثر ایسا تھا جیسے اس نے سویرا کی بات سنی ہی نہیں...... وہ صرف جواباً ''اچھا جی......'' کہہ کر خاموش ہو گیا۔
''تم یہ نہیں پوچھو گے کیوں خفا ہوں......؟'' سویرا کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔
''آپ خود ہی بتا دیجیے......'' اس نے مختصر جواب دیا۔
''تم میری شادی میں کیوں نہیں آئے...... میں خاص طور پر تمہیں کارڈ بھی دے کر گئی تھی......'' اس کی ذات میں موجود شیشے کی بلند دیواروں کے اندر ایک دم سے بھونچال آ گیا۔ شیشے دھڑا دھڑ بجنے لگے...... اندر کی زہریلی فضا میں اذیت بڑھ گئی...... وہ بمشکل بولا۔
''بی بی جی! میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان دنوں میں سخت بیمار تھا...... اس لیے نہیں آ سکا......''
''بعد میں بھی تم نے مبارک دینے کی زحمت نہیں کی...... کیا ناراض تھے مجھ سے؟'' آخری جملہ بڑی دلربائی سے کہا گیا تھا۔ دلاور کے وجود کا سارا لہو جیسے اس کے دل میں اکٹھا ہو گیا۔ دل دھڑا دھڑ بجنے لگا۔ وہ بولا۔
''نہیں بی بی جی! ...... میری آپ سے کیسی ناراضی۔''
''تم نے یہ بی بی جی...... کی کیا رٹ لگائی ہوئی ہے۔ سویرا نام ہے میرا......'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔
''نہیں بی بی جی...... اب نہیں......'' وہ روہانسا ہو گیا۔
''کیا اب نہیں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''اب آپ ہمارے بڑے سائیں کی بیگم صاحبہ ہو...... اب میں آپ کو نام سے نہیں پکار سکتا۔''
''کیا اسٹوپڈ باتیں کرتے ہو......''
''آپ جو مرضی کہیں جی... اب اس منہ سے آپ کا نام ادا نہیں ہو گا۔'' دلاور نے بے پروائی سے کہا تو یکدم سے سویرا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا...... یہ ایک الارم تھا...... ہلکا سا انڈی کیٹر تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں جو ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی، اس کی لہروں میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ گم صم بیٹھی ونڈ اسکرین سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتی رہی...... پھر جیسے کسی خیال سے جاگتے ہوئے بولی۔
''دلاور! ماروی کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے......؟''
وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بی بی جی! مجھے نہیں معلوم وہ لڑکی کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کئی دفعہ تو یوں لگتا ہے وہ مجھے نوکری سے نکلوا کے رہے گی......''
آخری بات دلاور نے اپنے پاس سے جان بوجھ کے لگائی تھی۔
سویرا ایک دم سے سیدھی ہو گئی، تھوڑے جوشیلے لہجے میں بولی۔ ''تم بالکل پروا نہ کرو...... تمہیں یہاں نوکری سے کوئی نہیں نکال سکتا...... اس کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں...... اور دوسری بات یہ کہ تم یہاں نوکر ہو بھی نہیں۔ تمہاری حیثیت کچھ اور ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے بات جاری رکھی۔ ''اور اگر تم واقعی ماروی میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''
''آپ میری کیا مدد کریں گی......؟''
''میں تمہاری شادی ماروی سے کروانے میں مدد کر سکتی ہوں۔ ویسے ایک دوست ہونے کے ناتے میں کہوں گی...... ماروی دل کی بہت اچھی لڑکی ہے...... تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگو گے۔'' سویرا کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔
دلاور سر جھکا کے تھوڑا سا کھانسا جس سے گلے میں لگا بے بسی کا پھندا اٹکل گیا۔ وہ بولا۔ ''بی بی جی......! آپ کے خلوص اور تعاون کا بے حد شکریہ...... مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا......''
''ماروی سے نہیں کرنا چاہتے...... یا......''
''میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا...... پتا ہے بی بی جی...... یہ سب دل کا کھیل ہے۔ جب دل مر جاتا ہے تو ہر چیز، ہر جذبہ ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے...... ہونے...... نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہتا...... زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''
سویرا کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے بولی۔ ''آگے کسی بازار پر گاڑی روکنا، مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔''
آگے پیٹرول پمپ کے ساتھ ایک اسنیک بار تھا، سویرا اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آئی اس کے ہاتھ میں بڑا شاپنگ بیگ تھا جس میں جنک فوڈ ٹائپ بہت سی چیزیں تھیں۔
دلاور یہ نہ جان سکا کہ سویرا رو کر اپنا من ہلکا کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے...... گلابی دکھنے لگے تھے۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ بہاولپور یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ بہت سے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سویرا بڑا شاپر لے کر ایک کوارٹر میں گھس گئی...... اس کی وہاں سے واپسی قریباً

آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔

وہ واپس آئی تو قدرے خوش تھی۔ بولی۔ ”چلو دلاور...... ہمیں اب صرف چندمنٹ کے لیے مین بازار میں رکنا ہے۔ پھر حویلی واپس چلیں گے......“

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ لوگ حویلی پہنچے...... گاڑی سے اترتے ہوئے سویرا بولی۔ ”دلاور! تم مجھے بی بی جی...... کہو...... یا جو مرضی کہو...... میری نظر میں پہلے بھی تم میرے دوست تھے، آج بھی میں تمہیں وہی دلاور سمجھتی ہوں۔ خود کو سنبھالو...... پہلے والے دلاور بن جاؤ...... جو ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ ہر کسی کا دل لگائے رکھتا تھا۔“

وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ایک دن دلاور بستر پر پڑا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ظفری معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”ایک خوش خبری ہے...... اور ایک بری خبر ہے۔ بول پہلے کون سی بتاؤں......“ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے سر پر ہاتھ مارا بولا۔ ”یار...... خبر اصل میں ایک ہی ہے مگر وہ کسی کے لیے اچھی ہے...... کسی کے لیے...... دل دُکھانے والی۔“

”پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے...... بات بتا کیا ہے؟“

”بات اصل میں یہ ہے کہ حویلی کی رونق، حویلی سے رخصت ہو گئی...... یہ ہوئی بری خبر اور اچھی خبر یہ ہے کہ ماروی سے تیری جان چھوٹ گئی ہے۔“

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”واقعی؟“

”ہاں...... واقعی...... ! سویرا بی بی نے ماروی کا نکاح بہاولپور میں ایک بندے سے کر دیا ہے۔ ان کی ایک کلاس فیلو کا کزن بہاولپور یونیورسٹی کے کوارٹرز میں رہتا ہے۔ خوش شکل اور محنتی ہے۔ ہے بھی ماروی کی برادری کا۔ سویرا بی بی نے ماروی کی ماں سے بات کی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی...... دو چار دنوں میں یہ سارا چکر چلا اور ماروی ساری حویلی کو سونا کر گئی۔“ ظفری ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔

دلاور کو یاد آنے لگا۔ سویرا اسی کے ساتھ تو بہاولپور گئی تھی۔ تو کیا وہ ماروی کے رشتے کے سلسلے میں گئی تھی؟ وہ انہی سوچوں میں تھا کہ ظفری نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا بولا۔ ”یار!...... تو بھی پتا نہیں کیسا مرد ہے...... وہ تیرے آگے پیچھے پھرتی رہ گئی اور تو نے اس کو گھاس تک نہیں ڈالی۔“

”گھاس ڈال کے کیا کرتا......؟“

”اس سے شادی کرتا...... کم از کم حویلی کی رونق یہاں سے رخصت تو نہ ہوتی......“

”تو بہت بے غیرت آدمی ہے۔ تب وہ تیری بھابی ہوتی۔“ دلاور نے ہنس کے کہا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا کھسیانا سا ہو کر بولا۔

”یارا! میں تھوڑا جذبات میں آ گیا تھا۔ پھر تو وہ واقعی ہماری بھابی بن جاتی...... سوری یار مجھے معاف کر دے...... یہ عورت ذات بڑی فتنے کی چیز ہے اور اگر خوبصورت ہو...... تو......“

دلاور نے کہا۔ ”ظفری! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی...... بڑے سائیں اور شاہ فرمان کراچی کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ پیر فضل سیہون شریف عرس کی تقریبات میں مصروف ہیں۔ پیچھے سے ماروی کا نکاح۔“

”اس میں کون سی انہونی بات ہے۔ ماروی کی ماں تو بیچاری بڑے عرصے سے ماروی کی شادی کے لیے فکر مند تھی...... ماروی کی خوبصورتی نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ بھلا ہو سویرا بی بی کا جنہوں نے خود آگے بڑھ کر یہ فرض ادا کیا ہے...... مالک ہوں تو ایسے ہوں......“

دلاور ظفری کی بات سن کر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بڑے سائیں اور شاہ فرمان دونوں کچھ دنوں سے کراچی میں ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دونوں بھائی ہی حویلی سے غائب ہیں۔“

”تو حویلی میں رہتے ہوئے بھی حویلی میں نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے جو تو رات بہت دیر تک روہی کے ویرانوں میں بیٹھا رہتا ہے، اس نے تیرے دماغ پر اثر کیا ہے۔ ایسی کھلی جگہوں پر بھوت پریت ہوتے ہیں...... آدمی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“

دلاور ہنس دیا بولا۔ ”ان سے زیادہ نقصان مجھے انسانوں نے پہنچایا ہے...... تو حویلی کے اندر والی بات بتا...... جو میں حویلی میں رہتے ہوئے بھی نہیں جانتا۔“

ظفری دلاور کی بات پر مسکرا دیا۔ انکشاف آمیز لہجے میں بولا۔ ”وہ بازو والا معاملہ تو، تو جانتا ہی ہے نا......“

دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اسی سلسلے میں دونوں بھائی کراچی میں ہیں۔ رحیم سائیں بھی کراچی میں ہیں۔ تم نہیں جانتے ہو گے، رحیم سائیں لا...... یہ منڈ بھیرو کے پاس ایک گوٹھ کے مالک ہیں۔“

دلاور، رحیم سائیں کو جانتا تھا مگر خاموش رہا...

سائیں وہی تھے جنہوں نے ...

زخمی شاہ زمان اور سویرا کی مدد کی تھی...

اپنے ڈیرے پر لے آئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کروائی تھی، بعد میں انہیں کھانا بھی کھلایا گیا تھا۔

ظلفری کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رحیم سائیں بیچ میں پڑ کر حضور چانڈیو اور بڑے سائیں کی صلح کروا رہا ہے۔ خبریں یہ آرہی ہیں۔ رحیم سائیں کافی حد تک کامیاب ہوگیا ہے۔ بڑے سائیں بھاری رقم کے عوض شان باز واپس کرنے پر راضی ہو گئے ہیں اور جو کیس عدالت میں چل رہا ہے، اسے بھی واپس لیا جارہا ہے۔''

ظلفری کچھ دیر خاموش رہا پھر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ''یارا! یہ ہمارے صاحب لوگ ویسے پیسے کے بڑے پجاری ہیں۔ دیکھو نا ...... ''شان'' باز خود چوری کروایا اور بعد میں بھاری رقم کے ساتھ اب واپس کیا جارہا ہے۔ حضور چانڈیو پارٹی سے حویلی پر حملے والی غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے وہ پھنس گئے۔ اب دیکھو یہ کیس چھ مہینے چلتا رہا۔ کیس ختم کروانے کے لیے علیحدہ سے رقم لی ہے بڑی سائیں اور شاہ فرمان نے .....''

''وہ کیسے ......؟'' دلاور حیرت سے بولا۔

''خون بہا ...... شاہ فرمان نے عدالت میں جو بیان دیا تھا، اس میں اپنا ایک بندہ مقتول بیان کیا گیا تھا۔ اسی لیے تو یہ کیس حضور چانڈیو کے گلے کا پھندا بنا رہا مگر اب یہ کیس ختم ہوگیا ہے یا ہونے کے قریب ہے۔ حضور چانڈیو سے اس بندے کا خون بہا لیا جارہا ہے۔ جو بھی قتل ہوا ہی نہیں، کیسی لطیفے والی بات ہے۔ دو بندوں کا تبادلہ بھی ہوگا ایک وہ جو حویلی پر حملے میں پکڑا گیا تھا۔ اس کے بدلے شاہ فرمان وغیرہ اپنا ایک خاص بندہ چھڑوائیں گے۔''

''ہاں شاید دنیا ایسی ہی ہے۔'' دلاور نے کہا۔ بلند شیشوں سے پار سورج چمک رہا تھا، ہوائیں چل رہی تھیں۔ زندگی سانس لے رہی تھی۔

☆☆☆

آج دلاور کی جائے پناہ پر کچھ اور لوگ قابض ہو گئے تھے۔ ڈھولکی بج رہی تھی۔ دف بج رہے تھے۔ گھنگھروؤں کی چھنکار پستہ قد بیری کے آس پاس رقص کررہی تھی۔ وہ چار طوائفیں تھیں جن کے جوان جسموں سے پسینا چھوٹ کر ان کی ایڑیاں بھگو رہا تھا۔ ان کے کمانوں کی طرح تنے، تنگ کپڑوں میں پھنسے، وحشی بدن میوزک کی دھن پر جلوے بکھیر رہے تھے۔ رات کے اس سمے جنریٹر کی آواز ڈھولکی اور دف کی آواز میں مدغم ہورہی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہائی جارہی تھی۔ یہ حضور چانڈیو سے بھاری رقم وصول کرنے کا جشن تھا۔ حیدرآبادی طوائفوں نے ناچ ناچ کر روہی کی ریتیلی زمین میں دنگا مچا دیا تھا۔ ایک جوان ...... میلے رنگ کا سرائیکی جس نے سر پر شیشوں والی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جس کا میلا چہرہ بھی جنریٹر کی تیز روشنی میں لشکتا تھا، کان پر ہاتھ رکھے کوئی تان لگا رہا تھا۔

طوائفوں پر جوں جوں نوٹ نچھاور کیے جاتے تھے، ان کے پیر اور زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔

''شان'' باز تین کروڑ کے عوض حضور چانڈیو کو واپس کیا جانا تھا۔ جرگے میں طے ہوا تھا کہ رقم پہلے ادا کردی جائے گی، باز تین دن بعد حضور چانڈیو کے گوٹھ میں خود شاہ فرمان پہنچا کر آئے گا۔ اس پر بہت اعتراض تھا۔ حضور چانڈیو نے کہا تھا کہ باز رقم ادا کرتے وقت ہمارے حوالے کیا جائے۔ جس پر دونوں بھائی متفق نہیں ہوئے۔ بہت لمبی چوڑی بحث کے بعد رحیم سائیں کی گارنٹی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہوگیا۔

رقم چوڈیرو حویلی والوں کے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔ جن دو بندوں کا تبادلہ ہونا تھا، وہ بھی ہو چکا تھا۔ جو آدمی حضور چانڈیو سے رہا ہو کر آیا اس کا نام ''ٹریگر'' تھا۔

اب رقم بینک میں کنفرم ہونے کے بعد فوری طور پر اس جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جشن ختم ہونے کے بعد اس رات نشے میں دھت شاہ زمان حویلی میں داخل ہوا۔ مہمان خانے میں اکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ شیرو! ماروی کو بلا کر لاؤ۔'' اس کا لب ولہجہ بالکل ٹن تھا۔

''مگر سائیں ...... اس وقت ...... اس وقت آپ سو جائیں۔'' شیرو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''رات کا ایک بج رہا ہے۔''

''بکواس کرتے ہو ...... زبان چلاتے ہو ...... بڑے سائیں کے آگے ...... کس حرامزادے کی مجال ہے ...... جو میرے حکم کو نہ مانے ...... بلاؤ ...... اس ناگن کو ...... جس نے ...... یہاں۔'' وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ''یہاں ڈنگ مارے ہیں ...... آج میں حساب برابر کرنا چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا بڑے سائیں!'' شیرو یہ کہتا ہوا پچھلے پاؤں پلٹ گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔ لرزتے لہجے میں بولا۔ ''وہ ...... وہ بڑے سائیں ...... ماروی تو یہاں نہیں ہے۔''

شاہ زمان گردن ٹیڑھی کرکے مخمور لہجے میں بولا۔ ''یہاں نہیں ہے ...... یہ کیا بکواس کررہا ہے ...... تو ......؟''

"بڑے سائیں! وہ...... وہ...... اس کی ماں...... جو ہے نا...... اس نے پچھلے ہفتے نکاح کر دیا ہے اس کا...... وہ چلی گئی ہے یہاں سے......"

یہ انکشاف نشے میں دھت شاہ زمان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا سائیڈ ٹیبل پر پڑا بیش قیمت گلدان گھما کر زمین پر دے مارا۔ شیشے کا وہ گلدان کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ناقابلِ یقین غراتے لہجے میں بولا۔ "لاؤ بلا کر اس کی ماں کو میرے پاس......"

اگلے چند منٹوں میں ماروی کی آدھی سوئی، آدھی جاگی ماں شاہ زمان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا...... وہ حواس باختہ تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی رات گئے اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ٹوٹے گلدان کو دیکھ کر اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ شاہ زمان کی آنکھوں میں لہو اترا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے، گہری خوفناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماروی...... کہاں ہے......؟"

"بڑے سائیں! اس کی شادی ہو گئی ہے...... اب وہ بہاولپور اپنے سسرال میں ہے۔"

ماروی کی ماں نے کانپتے لہجے میں کہا تو شاہ زمان ناقابلِ یقین تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اس بوڑھی کمزور عورت کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے، ایک جھٹکا دیا جس سے اس کی چادر اتر گئی۔ وہ درد سے کراہ اٹھی۔ بادلوں کی گرج سے لہجے میں بولا۔ "تیری مجال کیسے ہوئی اس کی شادی کرنے کی...... بڑے سائیں کے حکم کے بغیر تو یہاں پتا بھی نہیں ہلتا...... اور تو نے...... اتنا بڑا کام مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا......"

شاہ زمان نے ایک جھٹکے سے اسے پرے پھینکا۔ وہ نہایت قیمتی پانچ فٹ اونچے پلر گلدان پر گری۔ گلدان گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ماروی کی ماں کی کلائی زخمی ہو گئی۔ گلدان ٹوٹنے سے وہ اور طیش میں آ گیا یا اسے بہانہ مل گیا۔ اس نے بوڑھی عورت کو ٹھوکر پر رکھ لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ خدا رسول کے واسطے دینے لگی...... مگر الکوحل کے زیرِ اثر شاہ زمان کے کان پر جوں تک نہ رینگی...... اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وقت رکے جب اس عورت کے منہ سے سویرا بی بی کا نام نکلا۔ وہ لرزاں روتے لہجے میں بولی۔

"بڑے سائیں......! میری کیا مجال میں آپ کے حکم کے بغیر لڑکی کی شادی کروں...... وہ تو...... سویرا بی بی نے جلدی جلدی سارا انتظام کیا...... میں نے تو ایک دو دفعہ انہیں کہا بھی تھا کہ بڑے سائیں کی اجازت کے بغیر شادی کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا...... انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر بڑے سائیں نہیں ہیں...... تو کیا ہوا...... میں تو ہوں نا......"

شاہ زمان اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے اور آنکھوں کی غیر معمولی چمک میں کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی تھی...... شاہ زمان نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس عورت کو اٹھایا، چادر اسے تھمائی اور اشارہ کیا کہ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ......

دو تین دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ شاہ زمان نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا...... بس وہ ہر روز دلاور کے ساتھ "فیروزہ" نکل جاتا تھا۔ فیروزہ لیاقت پور اور چنی گوٹھ کے پاس ایک خوبصورت بستی تھی۔ شاہ زمان فیروزہ میں ایک دو منزلہ عالی شان مکان میں جاتا اور تین چار گھنٹے بعد وہاں سے نکلتا...... دلاور اتنی دیر باہر چھاؤں میں سستاتا رہتا۔ ایک دن شاہ زمان دو منزلہ مکان سے باہر آیا تو اس کے ساتھ بڑی سی پگڑی والا ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص بھی تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری جوتی تھی اور ہاتھ پاؤں غیر معمولی بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے پختون لگتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت پگڑی والے نے شاہ زمان سے مصافحہ کیا اور رواج کے مطابق اس کے گالوں کا بوسہ لیا۔ شاہ زمان کافی ہشاش بشاش تھا۔ چوڈیرو پہنچنے تک وہ پچھلی سیٹ پر پُرسکون انداز میں نیم دراز رہا۔ انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی نہایت اہم سنگِ میل عبور کر لیا ہے۔

☆☆☆

وہ چوڈیرو حویلی کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹی جا رہی تھی۔ حویلی کے کارندے ٹیپو ٹریگر کی خوشی میں اپنے انداز میں جشن منانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شاہ زمان بھی وہاں پر موجود تھا۔ وہ بھنگ کا رسیا تو نہیں تھا...... مگر کبھی کبھار شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ بھنگ بڑی بڑی تین، چار "دوریوں" میں گھوٹی جا رہی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اور سویرا سے "زخم" کھانے کے بعد اس نے ہر نشے کا ذائقہ چکھا تھا مگر فنا کی دیواریں کھڑی کرنے کے بعد اس نے یہ سب چھوڑ دیا تو نہیں تھا...... محتاط ضرور ہو گیا تھا۔

ایک سوکھے بدن کا لمبا تڑنگا کارندہ بڑے کڑاہے میں دودھ پھینٹ رہا تھا کہ اچانک سیبوں والی حویلی کے صدر دروازے سے دھول اڑاتی ہوئی جیپ اندر داخل ہوئی...... اس میں شاہ فرمان اور شیرو سوار تھے۔ دونوں بڑی عجلت میں جیپ سے اترے۔ چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی خیر کی خبر نہیں ہے۔ شاہ فرمان، شاہ زمان کو نہیں دیکھ سکا۔ دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اوئے۔ یہ تم لوگوں نے کیا کنجر خانہ لگا رکھا ہے۔ اٹھاؤ یہاں سے سب کچھ......'' اس نے ایک میز کو ٹھوکر ماری، ایک کرسی کو اٹھا کے پرے پھینکا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان کے بگڑے تیور دیکھتا ہوا شاہ زمان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہاں موجود تمام کارندوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ فرمان کی نظر شاہ زمان پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے کان میں سرگوشی کی...... شاہ زمان بڑے بھائی کی بات سنتا گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا...... جواب میں اس نے بھی شاہ فرمان سے آہستگی سے کوئی بات کی جس کا جواب شاہ فرمان نے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیا...... شاہ زمان کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کارندوں کو حکم دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین جیپیں مسلح جوانوں سے لد گئیں اور دھول اڑاتی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

دلاور منہ کھولے ظفری کی جانب دیکھنے لگا...... مگر ظفری بھی اس صورتِ حال سے اتنا ہی لاعلم تھا جتنا کہ دلاور...... رات گئے تک حویلی میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں...... مگر اصل صورتِ حال کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔

اس دن کے بعد حویلی کی فضا میں ایک بے نام سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ دبی دبی سرگوشیاں سر اٹھانے لگیں۔ ملازمین آپس میں مختلف قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اصل صورتِ حال کو چھپایا جا رہا تھا...... مگر سب جانتے تھے، اہم باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اس بات کو بھی جلد ہی کھلنا تھا۔

ماروی کی شادی والے معاملے کے بعد شاہ زمان خاموش تھا۔ اس نے سویرا کے سامنے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا...... وہ سیدھا وار کرنا چاہتا تھا...... اسی سلسلے میں دلاور کے ساتھ فیروزہ چکر لگاتا رہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عنقریب ایک خوبرو لڑکی اس حویلی میں سویرا بی بی کی سوتن بن کر آنے والی ہے۔

ایک دن دلاور نشست گاہ میں شاہ زمان کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ موقع دیکھ کر بولا۔ ''بڑے سائیں! برا نہ منائیں تو کچھ عرض کروں......''

وہ دلاور کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''ہاں...... بولو......''

''بڑے سائیں! آپ نے مجھ سے کہا تھا...... تم سے بہت ضروری کام لینا ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ نہ آپ نے مجھ سے وہ کام لیا اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ بتایا۔''

شاہ زمان کے چہرے پر سوچوں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کی انگلی ماتھے پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''بہت جلد...... میں تمہیں بتاؤں گا...... بس تم اپنی تیاری رکھو۔''

''بڑے سائیں! آپ حکم کریں۔ میں ہر دم تیار ہوں۔''

اسی دوران دھماکے سے دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر شاہ فرمان شیرو کے ساتھ اندر داخل ہوا...... شاہ فرمان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ شاہ زمان کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے بولا۔ ''چاچا فضل کی حضور چانڈیو سے بات ہوئی ہے۔ چاچے نے ان کو حوصلہ رکھنے کو کہا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہم چوڑیرو والے کسی اور کی زبان سے نہیں پھرتے۔''

''تو کیا کہا حضور چانڈیو...... نے......'' شاہ زمان کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

''...... بتایا ہے...... وہ جو حرام کا تخم...... شوکت سیال ہے نا...... وہ چانڈیو کو ابھار رہا ہے...... معاملے کو بگاڑنے کے لیے بڑھاوا دے رہا ہے...... بات کو...... کئی دفعہ تو دل میں آتا ہے کہ شوکت سیال کا پتا ہی صاف کر دیں بیچ میں سے۔''

''نہیں...... نہیں...... ہم نے ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کرنی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے...... ٹریگر کو تیار کیا ہے...... وہ جائے گا کچے کے علاقے میں...... ٹریگر نے ہی کافی معلومات بھی اکٹھی کی ہیں۔ کھرا ڈھونڈ لیا ہے اس نے۔''

''اس کا وہاں اکیلے جانا ٹھیک ہو گا؟'' شاہ فرمان نے سوال اٹھایا۔

''نہیں...... دو بندے اور بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ دونوں کچے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔''

''ان کی روانگی کب تک ہو گی؟''

''دو چار دن لگ جائیں گے...... ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے......'' شاہ زمان نے کہا۔

''مگر...... حضور چانڈیو......؟''

''اب اتنا انتظار تو اسے کرنا پڑے گا......'' شاہ زمان پُرسوچ لہجے میں بولا۔

(باقی اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کردیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہوجائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولوگے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ آگے چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس نے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفرِ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کردیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے میل ملاپ اور محبتوں کے
بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

دوسرا اور آخری حصہ

شاہ زمان جب سے کراچی سے لوٹا تھا، سویرا کو اس کا رویہ بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کرتی تھی۔ ماروی کے نکاح کے بارے میں دونوں میں بس سرسری سی بات ہوئی تھی۔ ابھی پچھلے ماہ میں شاہ زمان نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے کہا تھا...... کہ پھپھو عالیہ اور رمشا کو اب یہاں نہیں رہنا چاہیے...... اس میں ہماری ہی بے عزتی ہے۔ تو سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا...... مگر اگلے چند دنوں میں پھپھو عالیہ اور رمشا حویلی سے کوچ کر گئی تھیں۔ سادہ لوح سویرا نہیں جانتی تھی کہ اس کا ''بڑا سائیں'' دوسری شادی کی راہیں ہموار کر رہا ہے۔ وہ تو بس اس کے ہر فیصلے کے آگے سر جھکاتی چلی جا رہی تھی...... یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی شاہ زمان کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔

یہ بات سویرا کو پریشان کر رہی تھی۔ کیا عورت صرف مرد کی خدمت گزاری کے لیے بنی ہے؟ اس کو خوش رکھنا اس کا خیال رکھنا...... اس کی ضرورتیں پوری کرنا اور مرد کا جب دل چاہا ٹشو پیپر کی طرح اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے...... وہ ایسا ٹشو پیپر نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے تو شادی ایسے آدمی سے کی تھی جو اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اس کے دل میں رہنے کے لیے ہی تو سندھ یونیورسٹی سے اٹھ کر چوڈیرو آ گئی تھی مگر حالات کچھ اور اشارہ کر رہے تھے...... تقدیر کی کتاب کے ورق تیز آندھی کی زد میں پھڑپھڑا رہے تھے اور ایسے صفحے نگاہوں کے سامنے آنا چاہ رہے تھے جن میں...... سویرا کے لیے درد ہی درد لکھا تھا...... اور یہ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پوری حویلی میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ چوڈیرو حویلی اور حضور چانڈیو کے بیچ پھر کوئی نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے مگر اس تنازعے کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو خبریں گردش کر رہی تھیں اور جو قیاس لگائے جا رہے تھے، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ پھر سے باز کا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ پرندے کی رقم وصول کرنے کے باوجود چوڈیرو حویلی والے پرندہ حضور چانڈیو کے حوالے نہیں کر رہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ بدعہدی تھی مگر معاملے کی اصل حقیقت چند لوگوں کو معلوم تھی اور وہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ سننے میں یہ بھی آ رہا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان کشیدگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ تصادم کا خطرہ تھا۔ کچھ سمجھدار بڑے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ایک جرگہ بلایا اور دونوں پارٹیوں کے صرف بڑے اس جرگے میں شریک ہوئے۔ باتوں باتوں میں آوازیں بلند ہوگئیں۔ لہجے تلخ تر ہو گئے...... بندوقیں نکل آئیں...... مگر پھر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پیر فضل، رحیم سائیں نے اپنی پگڑیاں اتار کر پیروں میں رکھ دیں...... کچھ ضمانتوں، کچھ شرائط کے ساتھ یہ جرگہ ختم ہو گیا۔

چوڈیرو حویلی والوں کو دو ہفتے کی مہلت چاہیے تھی۔ وہ بالآخر مل گئی......

اس مہلت کے بعد یوں لگتا تھا...... حویلی میں چھائی تناؤ اور پریشانی کی کیفیت ختم ہوگئی ہے۔ ایک دن حویلی کے زنان خانے میں سیبوں کے چار کریٹ پہنچانے تھے...... ظفری...... دلاور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا...... مگر ظفری ضد پر اڑ گیا۔ اس دن دلاور نے زنان خانے کو پہلی دفعہ اندر سے دیکھا۔ جس وقت وہ کریٹ برآمدے میں رکھ رہے تھے، اوپری منزل کی بالکونی جو صحن کی طرف کھلتی تھی، اس پر سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا لگتا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ دلاور سے ملی، سویرا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی...... دلاور دل تھام کے رہ گیا۔ فنا کی دیواروں سے باہر کے منظر نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

اس نے جلدی سے کریٹ وہاں رکھے اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ظفری اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ ابھی دوپہر تھی، رات ہونے میں کافی وقت تھا...... پستہ قد کانٹوں والی بیری والی جگہ آباد کرنے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔

ظفری کی واپسی وہاں سے ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ آتے ہی چوکڑی لگا کر بستر پر بیٹھ گیا بولا۔

''اتنے دنوں سے جس بات نے میری نیند حرام کی ہوئی تھی، مجھے وہ پتا چل گئی۔'' دلاور نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے اس دن جب سب لوگ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹ رہے تھے تو چھوٹے سائیں شیرو کے ساتھ بڑی گھبراہٹ میں وہاں آئے تھے...... پتا ہے کیا خبر لائے تھے؟''

''مجھے کیا پتا......؟'' دلاور بےزاری سے بولا۔

''جو باز انہوں نے ترنڈا کی سفید حویلی کے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا، وہ وہاں سے پھر چوری ہو گیا۔''

''او خدایا...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔
''جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے...... اس خبر نے چوڈیرو حویلی کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلا شک شوکت سیال اور حضور جانڈیو پر کیا گیا۔ باز کی چوری پوشیدہ رکھی گئی اور بڑے سائیں نے اپنے گماشتے ہر طرف بھگائے...... بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ باز حضور جانڈیو نے چوری نہیں کرایا بلکہ اسے چوری کرنے والے لوگ کچے کے علاقے سے آئے تھے۔ وہ چوری شدہ باز اب راجن پور سے آگے پانی کے بہاؤ سے پار کچے کے علاقے میں ہے۔ پہلے پہلے تو یہ بات حضور جانڈیو سے چھپائی گئی۔ ایک ہفتے تک انہیں جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دیے جاتے رہے مگر جب باز.... پہنچانے والی مہلت ختم ہوگئی...... تو حضور جانڈیو نے سنگین نتیجے کی دھمکی دے دی۔ دونوں طرف سے کشیدگی بے حد بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی نئی جنگ شروع ہو جاتی، بیچ میں رحیم سائیں اور پیر فضل کود پڑے۔ انہوں نے ایک جرگے کا اہتمام کیا...... جرگے میں بھی بدمزگی ہوگئی۔ شوکت سیال بدزبان اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے شاہ فرمان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی...... دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں۔ فائر ہوتے ہوتے رہ گیا...... رحیم سائیں اور پیر فضل نے اپنی پگڑیاں اتار کر لڑنے والوں کے پاؤں میں پھینک دیں۔ اس خوفناک صورتِ حال سے نبٹنے کے بعد پیر فضل نے مخالفین کو صاف صاف بتا دیا کہ باز چوری ہو چکا ہے۔ ہم لوگ وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جیسے بھی ہوگا، وہ باز واپس کریں گے اور پھر باز کی واپسی کے لیے دو ہفتے کی مہلت مانگی گئی۔ وہ مہلت اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ اگر شاہ زمان وہ باز دو ہفتوں میں واپس نہیں کرتا تو تین کروڑ کی رقم...... اور خون بہا والی رقم فوری طور پر حضور جانڈیو کو واپس کی جائے......''

ظفری خاموش ہوا تو دلاور کے چہرے پر حیرانی تھی۔ وہ بولا۔ ''تمہیں ان باتوں کا کہاں سے پتا چلا؟''

ظفری ہنس دیا۔ ''تم آم کھاؤ پیڑ مت گنو...... ہماری پہنچ بھی حویلی کے اندر تک ہے۔'' وہ آنکھ میچ کے بولا۔

☆☆☆

اس دن شاہ زمان، دلاور کو فیروزہ والی کوٹھی کے اندر لے گیا۔ دلاور اک سائڈ پر کرسی پر براجمان تھا۔ دوسری طرف بڑی میز پر بھاری جسامت والا پٹھان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر چٹی سفید عورت بیٹھی تھی جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ ایک میلے سے چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا نام صغراں تھا۔ تیز طرار اور آنکھیں مٹکانے والی صغراں بولی۔

''مفید جان! بڑے سائیں کو تھوڑا وقت اور دو......''

مفید جان ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''ام اپنی طرف سے دو سال دینے کو تیار ہے مگر...... گارنٹی کوئی نہیں ہے۔ وہ حرام کا پلا کسی وقت بھی پہنچ گیا تو...... گڑبڑ ہو جائے گا......''

''مفید جان! گڑبڑ کو ہم سنبھال لیں گے...... مگر ابھی ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے...... میں صرف بیس بائیس دن ہی تو مانگ رہا ہوں......'' شاہ زمان نے کہا۔

چٹی سفید عورت بولی۔ ''تم بیس بائیس دن کی بات کرتے ہو...... ہم ایک دو دن کی گارنٹی بھی نہیں دے سکتے...... ادھر ابھی...... ام سے صاف صاف بات کرو...... اور قصہ خلاص کرو...... پرسوں اگر تم برات لے کر آتا ہے تو ٹھیک...... ورنہ ہم یہ شادی کینسل کرے گا......'' عورت جتنی خوبصورت اور نرم و نازک دکھتی تھی، اس کا لہجہ اتنا ہی کڑوا کسیلا تھا۔

صغراں بولی۔ ''بڑے سائیں! آپ ایسا کریں آج مشورہ کر لیں...... کل...... آ کر ان کو بتا دیں گے......''

مشورہ کرنے کی بات پر شاہ زمان بھڑک اٹھا...... چوڈیرو حویلی کا ازلی جوشیلا خون اس کے دماغ کو چڑھ گیا۔ غصے کو حتی الامکان دباتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کس سے مشورہ کرنا ہے...... دنیا مجھ سے آ کر مشورہ مانگتی ہے۔ میں یہیں کھڑے کھڑے ہر فیصلہ کر سکتا ہوں۔ وہ تو بس بیچ میں ایک اڑچن آ گئی ہے۔ نہیں تو......''

طیش میں آنے کے بعد شاہ زمان نے جو فیصلہ کیا وہ سراسر مفید جان وغیرہ کی مرضی کے مطابق تھا۔ طے ہوا کہ صرف دو دن بعد ہفتے کی شام کو شاہ زمان دس پندرہ خاص بندوں کے ساتھ آئے گا اور گلِ لالہ کو نکاح میں لے جائے گا۔ اس نے مفید جان وغیرہ کو تاکید کی کہ مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ اس نے ایک موٹی رقم بھی اس سلسلے میں مفید جان کو دے دی۔

اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا شاہ زمان نے کہا تھا۔ ایک شام بڑی رازداری کے ساتھ شاہ زمان خوبرو گلِ لالہ کو اپنی دلہن بنا کر چوڈیرو حویلی میں لے آیا۔ جن لوگوں نے نکاح میں شرکت کی تھی ان میں بڑی آپا اور نگینہ بیگم کے علاوہ دو تین ملازمائیں بھی شامل تھیں جو زرق برق کپڑوں میں شاہ زمان کی رشتے دار ہی دکھائی دیتی تھیں۔

یہ ظلم سویرا پر ہوا تھا لیکن وہ جیسے پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔ دو تین دن سے بالکل سکتہ زدہ سی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے یہ سب کچھ سہنا ہے اور سہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس حویلی کی دیواریں بڑی اونچی تھیں۔ آج کل اس حویلی میں صرف ایک ناک کٹی نگینہ بیگم موجود تھی لیکن اس سے پہلے بھی یہاں نہ جانے کتنی ناک اور کان کٹیاں اور زندہ لاشیں چلتی پھرتی رہی تھیں، وہ سب کچھ خاموشی سے جھیل گئی تھی، آپا نے اسے یہ تسلی بھی دی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ کڑی کو تین چار مہینے پاس رکھ کر شاہ زمان اسے فارغ کر دے۔ یعنی تحفے تحائف دے کر طلاق دے دے مگر ایک راستہ تو کھل ہی گیا تھا نا، ایک کو طلاق ہو بھی جاتی تو تیسری سے بیاہ ہو سکتا تھا۔

دلاور بھی اس صورتِ حال پر ششدر رہتا تھا۔

نئی دوہٹی باقاعدہ سجی سجائی اونٹ گاڑی پر بیٹھ کر چوڈیرو حویلی میں آئی تھی۔ شاہ زمان نے حویلی کے چھوٹے بڑے ملازموں میں خوب پیسے بانٹے تھے۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی لالی تھی۔ چند ماہ پہلے سویرا نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور اس کی غیر حاضری میں ماروی کا نکاح پڑھوا کر اسے چلتا کیا تھا...... اس نے بے خوفی کے ساتھ...... شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے کی حرکت کی تھی۔

اس کے جواب میں شاہ زمان نے خاموشی اختیار کی تھی۔ تھوڑا عرصہ صبر کیا تھا اور پھر انتقامی طور پر وہ اپنے سے کئی سال چھوٹی لڑکی کو اپنی دلہن بنا کر اس حویلی میں لے آیا تھا۔ اس رات گلِ لالہ کے پاس جانے سے پہلے وہ سویرا کے پاس آیا تھا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ''سویرا! عورتیں ہمیشہ سے خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی آئی ہیں۔ وہ یہ تصور کر لیتی ہیں کہ وہ مردوں کو اپنے اشاروں پر چلا سکتی ہیں مگر میں آج تمہیں بتاتا ہوں ان میں اکثر احمق ہوتی ہیں تمہاری طرح۔'' وہ انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

سویرا بت بنی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گرتے رہے۔ وہ اس زہر کا پیالہ لبوں سے لگائے بیٹھی تھی جس کو پینے کا تصور بھی اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ وہ سویرا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''سویرا! تم نے سوکن سے بچنے کے لیے مجھ سے ماروی چھینی لیکن سوکن پھر بھی آ گئی اور یہ سلسلہ ابھی آگے چلے گا۔''

اس قیامت خیز رات کے بعد سویرا مر گئی۔ سندھ یونیورسٹی میں چہلیں کرنے والی، ہر دم مسکرانے والی سویرا مر گئی۔ اس دن کے بعد وہ ایک زندہ لاش کے مانند ہو گئی۔ وہ زندگی کے تمام معمولات نبھا رہی تھی مگر اس کے وجود میں کوئی چیز تھی جو فنا ہو گئی تھی۔

شاہ زمان نئی بیوی کے نشے میں مست تھا۔ وہ جو کبھی سویرا کے لیے آہیں بھرا کرتا تھا، آج یوں لاتعلق بنا پھرتا تھا جیسے اس نام کی کوئی لڑکی اس حویلی میں رہتی ہی نہ ہو۔

دلاور دو تین دفعہ گاڑی پر سویرا کو بہاولپور...... عالیہ پھپھو سے ملوانے کے لیے لے کر گیا مگر سارے رستے سویرا نے دلاور سے کوئی بات نہیں کی۔ بس گم صم سی بیٹھی باہر خالی نگاہوں سے گزرتے مناظر کو دیکھتی رہتی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھنا دلاور کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ سویرا خود کو دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورت تصور کرنے لگی تھی ...... مگر اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کوئی ہزار ہا شدتوں کے ساتھ اسے چاہتا ہے۔ اس کی ایک مسکان کے بدلے اپنی جان لٹا سکتا ہے۔ وہ اس عشق کی شدتوں سے ناواقف تھی جو دلاور کے سینے کی گہرائیوں میں موجزن تھا۔

ایک دن بہاولپور پہنچنے پر جب نڈھال سویرا گاڑی سے اتری تو اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔ دلاور اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھا۔ وہ بے ساختہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا، اس کے چہرے پر پھیلنے والے سائے اور آنکھوں کی بے قراری دیکھ کر سویرا حیران رہ گئی، ان بے قرار آنکھوں میں سیکڑوں افسانے رقم تھے۔

اس پریشان چہرے پر ہزاروں ایسی تحریریں نقش تھیں جو آج سے پہلے سویرا کو نظر نہیں آئی تھیں ...... یا شاید ...... یہ تحریریں ہمیشہ سے تھیں کبھی سویرا نے انہیں پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ایک سطر پڑھتی گئی اور دل کے نہاں خانے میں جو ندی تھی اور جس کی لہروں میں کبھی کبھار تلاطم پیدا ہوتا تھا، آج وہ تلاطم حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس میں موجود رنگ برنگی مچھلیاں اچھلنے کودنے لگیں۔

سویرا کھڑی ہوئی تو اس کے پاؤں میں لنگڑاہٹ تھی۔ اس نے سنبھلنے کے لیے سہارا لینا چاہا مگر دلاور کے علاوہ آس پاس کوئی ''سہارا'' موجود نہیں تھا۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے دلاور کا ہاتھ تھام لیا۔ دلاور نے ڈگمگاتی سویرا کو تھام لیا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر تک لے گیا۔ سویرا کی آنکھوں میں نمی تھی ...... وہ نمی پاؤں کی تکلیف کی تھی یا دلاور کے سہارے کی ...... دلاور یہ نہ جان سکا۔

واپسی پر سویرا قدرے بہتر تھی۔ اس نے خاموشی توڑ دی اور بولی۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

''بی بی جی ...... کس بات کا ......'' وہ عقب نما آئینے

میں دیکھ کر بولا۔

"مجھے سہارا دینے کا......" وہ ممنونیت سے بولی۔

"میں تو آخری سانس تک آپ کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوں۔" دل کی بات وہ زبان پر نہ لاسکا بولا۔.... بی بی جی......! ایک بات بولوں۔" سویرا کا سوالیہ انداز دیکھ کر کہنے لگا۔"بی بی جی......! آپ خوش رہا کریں۔ آپ ایسے خاموش اور پریشان اچھی نہیں لگتیں......"

سویرا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بالوں کی لٹ کو دھیرے سے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

"دلاور! خوش رہنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہے......مگر...... میں زندگی سے دور ہوتی جارہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بے پناہ کرب اُمڈ آیا۔ دلاور اس کا غم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

اس کے جواب میں دلاور کے ذہن میں کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ شیشے کی بلند دیواروں کو پھاندنا نہیں چاہتا تھا......وہ فنا کی چار دیواری سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلا دن دلاور کے لیے بڑا دھماکا خیز تھا۔ پوری حویلی میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے جب شاہ زمان نئے خریدے گئے اونٹوں کا معائنہ کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ملازمین کی ایک فوج کھڑی تھی۔ دلاور بھی ان میں شامل تھا کہ صدر دروازے کی طرف سے ایک جیپ دھول اڑاتی ہوئی آئی۔ شاہ زمان کے پاس پہنچ کر وہ جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ اس میں سے دو بندوق بردار بڑی سرعت سے نکلے۔ انہوں نے جیپ کی پچھلی جانب سے جھک کر ایک زخمی آدمی کو نکال کر باہر لٹا دیا، وہ ٹیپو ٹریگر تھا۔ وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر وہاں کھڑے سب لوگ ششدر رہ گئے۔ شاہ زمان غصیلے لہجے میں دھاڑتے ہوئے بولا۔"اوے...... یہ کیا ہے......کس نے زخمی کیا ہے اسے!"

"بس بہت گڑبڑ ہوگئی ہے جی۔" بندوق بردار نے کہا، پھر وہ آگے کو جھک کر بڑی رازداری سے زمان کو کچھ بتانے لگا۔

ٹریگر سیریس حالت میں دکھتا تھا۔ شاہ زمان کے کہنے پر اسے فوری طور پر اسپتال بھجوا دیا گیا۔ شاہ زمان پریشانی میں پیشانی مسلنے لگا۔ اس نے شاہ فرمان کو فون ملایا اور اس سے بات کرنے لگا......تھوڑی دیر بعد پیر فضل، شاہ فرمان کو لے کر حویلی پہنچ گیا......تینوں سر جوڑ کر حویلی کی نشست گاہ میں بیٹھ گئے......ایک گھنٹے بعد شاہ زمان نشست گاہ سے نکلا

اور اس نے دلاور کو جلدی سے گاڑی نکالنے کا کہا۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ نزدیکی اسپتال میں تھے۔ ٹیپو ٹریگر آئی سی یو میں تھا اور ہوش میں تھا۔ شاہ زمان کو اندر جانے کی اجازت مل گئی اور کیوں نہ ملتی۔ اسپتال کا ایم ڈی اس کا نمک خوار اور اطاعت گزار تھا۔ دلاور باہر کھڑا کھڑکی سے سب دیکھنے لگا۔ ٹیپو ٹریگر شاہ زمان سے کوئی بات کررہا تھا جسے شاہ زمان بڑے غور وانہماک سے سن رہا تھا۔ وقفے وقفے سے شاہ زمان اس سے کچھ پوچھنے بھی لگ جاتا...... یہ ملاقات آٹھ دس منٹ تک جاری رہی...... پھر شاہ زمان بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔

واپسی پر دلاور نے پوچھا۔"بڑے سائیں' ٹیپو بچ تو جائے گا؟"

شاہ زمان کسی خیال سے چونکا پھر تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔"اسے کچھ نہیں ہونے والا۔ ببر شیر ہے وہ...... حضور چانڈیو کے قبضے میں اتنی دیر رہ کر بچ نکلا ہے تو کوئی بات تو ہے نا اس میں۔"

شاہ زمان چند سیکنڈ تک مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا پھر دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔"جیپ ذرا سامنے، ان درختوں میں روکو۔"

دلاور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی جیپ روک دی۔ سائے گہرے ہورہے تھے۔ سورج مغربی افق میں چہرہ چھپا چکا تھا۔ دلاور سوالیہ نظروں سے شاہ زمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔"دلاور! میں نے ایک دن تجھ سے کہا تھا نا......کہ تجھ سے ایک بہت خاص کام لینا چاہتا ہوں۔ بس سمجھو وہ وقت آگیا۔ تو اپنے آپ کو تیار کرلے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ کام بس تو ہی کرسکتا ہے۔"

دلاور کی دھڑکن انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ بولا۔"بڑے سائیں! آپ حکم کریں، جان بھی حاضر ہے۔"

شاہ زمان نے سگریٹ سلگایا اور اگلے آٹھ دس منٹ میں شاہ زمان کو جو کچھ بتایا، وہ تحیر خیز تھا۔ یہ بات تو خیر دلاور پہلے ہی جان چکا تھا کہ باز چوری ہوچکا ہے، مگر یہ خبر اسے شاہ زمان کی زبانی ملی کہ ٹیپو ٹریگر کے زخمی ہونے کی وجہ وہ باز ہی ہے۔ دراصل دو دن پہلے شاہ زمان نے اپنے اس دستِ راست کو باز کی بازیابی کے لیے ہی کچے کے ایک دور دراز گوٹھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ وہاں کوئی بہت بڑی اور پرانی حویلی تھی جسے کچا قلعہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علاقے کے ایک بدنام شخص ساجے بٹھل نے وہ باز کچا قلعہ میں رکھا

ہوا تھا اور وہاں اس کی حفاظت کا محفوظ انتظام تھا۔ شاہ زمان نے جو کچھ کیا تھا پلاننگ کے ساتھ کیا تھا مگر پلاننگ کامیاب نہیں ہوئی اور ٹریگر شدید زخمی ہو کر واپس آ گیا تھا۔ دراصل کل رات، شب برات کی تھی۔ شاہ زمان وغیرہ کو معلوم ہوا تھا کہ اس تہوار کے موقع پر کچا قلعہ میں سا بجے جھیل کے بس دو چار پہریدار ہی موجود ہوں گے اور اگر اس موقع کا فائدہ اٹھا کر شب خون مارا جائے تو باز کو وہاں سے نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیپو ٹریگر پرسوں بڑی رازداری سے اس مہم پر نکلا تھا مگر وہاں پہریدار توقع سے زیادہ تھے۔ یہ لوگ کچا قلعہ کے اندر بھی داخل نہ ہو پائے تھے اور دو طرفہ فائرنگ میں ٹیپو ٹریگر کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

اور اب شاہ زمان یہ کام دلاور کے سپرد کرنے جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس کا علم دلاور کو تھوڑی دیر بعد ہوا۔ شاہ زمان نے کچھ دیر تک سوچ میں غرق رہنے کے بعد کہا۔

"دلاور! کچا قلعہ کا سارا نقشہ میرے پاس ہے۔ یہ ساری عمارت ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ تین طرف تو سا بجے کے خطرناک کارندے پہرے پر رہتے ہیں لیکن چوتھی طرف پہرے کا نظام اتنا سخت نہیں ہے۔ اس طرف ایک بڑی برساتی جھیل ہے۔ چوڑائی کوئی آدھ فرلانگ کے قریب ہوگی، لمبائی ایک ڈیڑھ میل ہے۔ اگر کوئی اچھا تیراک چوڑائی کی طرف سے اس جھیل کو احتیاط سے پار کر لے تو کچے قلعے کی پچھلی طرف سے اندر گھس سکتا ہے۔"

"احتیاط سے پار کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے جناب؟"

"میری معلومات کے مطابق یہ حرامزادے رات کے وقت بھی جھیل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہاں جنریٹرز ہیں اور سرچ لائٹس وغیرہ بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ جھیل پار کرنے والے کو پانی کے اوپر آئے بغیر تیرنا پڑے گا اور پتا نہیں کیوں...... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تمہارے اندر اس کام کو کرنے کی خداداد صلاحیت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، مجھے وہ منظر زندگی بھر نہیں بھولے گا......"

اس کے بعد شاہ زمان اس واقعے کی تفصیل میں کھو گیا جب دلاور نے زبردست پیراکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ زمان اور سویرا کو پانی کی بے رحم موت سے بچایا تھا۔ اب ساری کڑیاں مل رہی تھیں اور بات دلاور کی سمجھ میں آ رہی تھی ...... وہ وہیں جیپ کے نیم گرم ماحول میں بیٹھے تھے۔ شاہ زمان اور دلاور کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوئی۔ شاہ زمان نے دلاور کو کچا قلعہ کا وہ نقشہ بھی دکھایا جو ہاتھ سے بنایا گیا تھا۔ اس میں اس خاص جگہ کی نشاندہی بھی تھی جہاں وہ نہایت قیمتی پرندہ موجود تھا۔ ایک ایسا پرندہ جس کے حصول کے لیے دو شیخوں نے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ پرندے کو کچا قلعہ کے ایک محفوظ حصے میں رکھا گیا تھا لیکن اگر کوئی شخص پانی کی طرف سے کچا قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے لیے پرندے تک رسائی چنداں مشکل نہ رہتی اور یہ بڑا اہم نکتہ تھا۔ شاہ زمان اور دلاور نے اس سارے معاملے پر بے حد تفصیل سے بات کی اور بہت سی جزئیات طے کر لیں۔

☆☆☆

یہ دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ وہ ایک سرد تاریک رات تھی۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تھا۔ دلاور اپنے ساتھی بالے کے ساتھ شام کے فوراً بعد ہی کچا قلعہ کے نواح میں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں، ایک ایسے لوڈر کے ذریعے یہاں آئے تھے جو یہاں دودھ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے لوڈر میں جان بوجھ کر نقص پیدا کر دیا تھا اور اسے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اقبال عرف بالا لوڈر میں ہی تھا۔ دلاور جھیل کے کنارے سرکنڈوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے چست پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک فٹ کا دو دھاری خنجر اس کی ریگ زین کی جیکٹ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ واٹر پروف ٹارچ اور چھوٹا پسٹل بھی تھا جسے پانی کی زد سے بچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچا قلعہ کا نقشہ بھی ایک پولیتھین میں لپیٹ کر اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا واٹر کولر تھا جسے دلاور نے بیلٹ کے ذریعے اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ یہاں اس دنیا میں تھا بھی کون اس کو رونے والا۔ اسے وہ مہربان عورت یاد آئی جس کے کچھ بال سفید اور کچھ مہندی رنگے تھے۔ وہ اس کی ماں کی طرح تھی۔ اس عورت سے دلاور کے دل کے بہت سے تار جڑے ہوئے تھے۔ جب وہ عورت اس دنیا سے رخصت ہوئی تو بہت سے تار ٹوٹ گئے لیکن بہت سے اب بھی سلامت تھے۔ اب ایک اور عورت سے اس کے دل کے تار جڑے تھے اور یہ سویرا تھی اور یہ تار اتنے مضبوط تھے کہ شاید...... دلاور کی موت پر بھی نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔ وہ ان دنوں جو کام بھی کرتا تھا، جس طرف بھی جاتا تھا، اسے اپنے سامنے سویرا ہی نظر آتی تھی۔ اب بھی یوں تو وہ شاہ زمان کے کہنے پر ایک "کام" کے لیے نکلا تھا مگر اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سویرا کی

خاطر سب کچھ کر رہا ہے۔ یہ کیسا ناتا تھا، کیسا رشتہ تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، جب سویرا کی شادی ہوگئی تو دلاور نے چوڈیر دحویلی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر پھر شاہ زمان کے اصرار نے اسے روک لیا اور شاید وہ خود بھی رک جانا چاہتا تھا۔ خود کو اذیت دینے کے لیے یہ ایک ایسی خواہش تھی جسے وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا اور اب تو صورتِ حال ایسی ہوگئی تھی کہ دلاور ہر صورت یہاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، شاہ زمان کی دوسری شادی کے بعد سویرا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے، مرجھاتی جارہی ہے، اس کی جڑیں سوکھ رہی ہیں۔ وہ اسے ایسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس کے آس پاس رہنا چاہتا تھا...... حویلی میں رہنا چاہتا تھا اور حویلی میں رہنے کے لیے اسے شاہ زمان کا اعتماد جیتنا تھا۔ اس پر ثابت کرنا تھا کہ وہ اس کی ضرورت ہے اور یہی ثابت کرنے کے لیے وہ آج دیوانہ وار اس سرد جھیل کے کنارے موجود تھا۔

اس نے جھیل کی خاموش سطح کو دیکھا...... ہاں وہ پانیوں کا شناور تھا۔ سرفودم گھٹ کے ''ساتھ'' اور اس کی سخت تربیت نے اسے پیراکی کے ہنر میں طاق کردیا تھا...... وہ گہرے پانیوں کی مچھلی کی طرح ہوگیا تھا۔ گہرے پانیوں کی مچھلی جو سخت دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے۔ بس اپنا یہی ایک ہنر تھا جس پر وہ ناز کرسکتا تھا۔

اللہ کا نام لے کر وہ پانی میں اترا۔ غوطہ لگایا اور نیچے ہی نیچے تیرنا شروع کردیا۔ اس کے پاس قدرت کا تحفہ تھا۔ وہ پانیوں کے نیچے سانس روک لیتا تھا اور اتنا روکتا تھا کہ کناروں پر کھڑے اس کی زندگی سے مایوس ہوکر چلانے لگتے تھے۔ آج بھی وہ اپنے اس Skill کو استعمال کررہا تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنا سر سرد پانی سے باہر نکالا...... اپنے رخ کا تعین کیا اور پھر ڈبکی لگادی۔ دوسری مرتبہ بھی قریباً پانچ منٹ بعد ہی وہ بے آواز...... سطح آب پر ابھرا۔ ایک فکس سرچ لائٹ کی روشنی جھیل کے اس حصے کو مسلسل روشن رکھے ہوئے تھی۔ اوپر فصیل نما دیوار پر کوئی پہریدار حرکت کررہا تھا۔ وہ ایک بار پھر پانی میں روپوش ہوگیا...... اس مرتبہ اسے زیادہ دیر پانی میں رہنا تھا۔ اس کے پھیپھڑے آکسیجن کی طلب میں پھٹنے لگے لیکن یہ مشکل ترین مرحلہ بھی بالآخر گزر گیا۔

وہ بلند دیوار کی جڑ میں اس بارشی پانی کے پائپ کے پاس پہنچ چکا تھا جس کی نشاندہی نقشے میں موجود تھی۔ یہ کوئی 30 انچ قطر کا قدیم پائپ تھا۔ شاید انگریزوں کے دور کا۔

دلاور اس پائپ میں داخل ہوا اور اپنی پنسل ٹارچ روشن کرلی۔ پائپ کے اندر بھی پانچ چھ انچ تک بدبودار پانی موجود تھا۔ جگہ جگہ جالے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مینڈکوں اور چوہوں سے بھی سابقہ پڑا مگر وہ ان سارے مسائل کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوکر آیا تھا۔ وہ کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر عمارت کے ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچ گیا جہاں کئی چھتوں کے پرنالے آکر گرتے تھے۔

اب دلاور نے اپنا پستول نکال لیا اور ہر آمدہ خطرے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات کے اس پہر کچا قلعہ کے بیشتر مکین یقیناً سو رہے تھے۔

حقیقی خطرے سے دلاور کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ عمارت میں قریباً سو میٹر اندر آچکا تھا۔ ایک پرچھائیں اس پر جھپٹی۔ یہ ایک مسلح شخص تھا۔ دلاور کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پھرتی سے نہ صرف خود کو حملہ آور کے وار سے بچایا بلکہ اسے گھما کر اتنی زور سے ایک دیوار کے ساتھ مارا کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمیں بوس ہوگیا۔

آواز پیدا ہوئی تھی۔ دلاور نے ایک تاریک کونے میں چھپ کر کچھ دیر ردعمل کا انتظار کیا پھر مطمئن ہوکر باہر نکل آیا۔ پہریدار کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک تو ہوش میں نہیں آئے گا۔ دلاور نے اس کی شلوار قمیص کی تلاشی لی۔ واسکٹ کی ایک جیب سے چابیوں کا گچھا نکلا۔ ان میں سے ایک چابی بھاری بھرکم محرابی دروازے کی تھی۔ دلاور نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ بے ہوش پہریدار کو گھسیٹ کر تیل کے ڈرموں کے پیچھے گھسیڑا اور پنسل ٹارچ سے نقشہ دیکھنے کے بعد آگے بڑھنے لگا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

سب کچھ ٹھیک جارہا تھا۔ دلاور کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مطلوبہ کمرے تک پہنچ جائے گا۔ مزے کی یہ بات تھی...... سامنے کی طرف تو ہر طرح کے حفاظتی انتظامات تھے لیکن عقبی جانب کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کمرے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پالتو طوطوں کی چوں چوں سنائی دی۔ بے شک یہی باز والا کمرا تھا۔ دلاور نے پستول جیکٹ میں رکھ کر دودھاری خنجر ہاتھ میں لے لیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے غنودگی بھری آواز آئی۔

دلاور نے دوبارہ دستک دی۔ ایک جوان لڑکے نے

دروازہ کھولا اور مچی مچی آنکھوں سے دلاور کو دیکھا۔ ایک دم اس کی نگاہ دلاور کے چمک مارتے خنجر پر پڑی۔ اس نے شاید چلانے کے لیے ہی منہ کھولا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دلاور نے اسے جکڑ لیا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دائیں ہاتھ میں خنجر تھا اور یہ لڑکے کی عین شہ رگ پر تھا۔

لڑکے کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ دبلا پتلا لیکن زور والا تھا۔ دلاور نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا اور پھنکارا۔ ''زور مارو گے تو گردن کاٹ دوں گا، ابھی لاش پڑی نظر آئے گی۔''

وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور دلاور کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دلاور نے پھر سرسراتی سرگوشی کی۔ ''گردن کٹ جائے گی تیری کسی کا کچھ نہیں جائے گا۔''

لڑکے میں ہوش کم اور جوش زیادہ تھا۔ وہ پھر بے طرح پھڑکا، دونوں گرتے گرتے بچے۔ اب دلاور کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ خنجر استعمال کرتا مگر لڑکے کی کم عمری دیکھتے ہوئے اسے ترس آیا۔ کسی ماں کا بیٹا تھا، ابھی تو اس نے جینا شروع کیا تھا...... ابھی تو شاید کسی سویرا نے اس کی زندگی میں آنا تھا، ابھی تو شاید......

اس نے گردن کے بجائے لڑکے کے پیٹ کے نچلے حصے کو نشانہ بنایا۔ خنجر پہلے لڑکے کے سویٹر پھر کپڑے اور پھر گوشت میں گھسا۔ لڑکے کی خطرناک مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ تب دلاور نے پستول کے دستے سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں اور بوسیدہ فرش پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ اردگرد کی آہٹیں سنتا رہا پھر کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں اس مستطیل کمرے میں تین چار چھوٹے بڑے پنجرے تھے۔ ایک بڑے پنجرے میں کونجیں تھیں۔ ایک میں طوطے تھے۔ ایک بڑے پنجرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں ایک مقامی شکرا بند تھا، دوسرے میں وہ نایاب عقاب تھا جس نے ان گنت لوگوں کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ وہ واقعی بے مثل پرندہ تھا۔ پروں کی چوڑائی حیران کن تھی۔ اسے دیکھ کر دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوتی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ ایک بار پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

اس پنجرے میں اس نایاب پرندے کے آرام و آسائش کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ اسے بے قراری سے بچانے کے لیے اس کے سر پر مخمل کی اندھیاری چڑھائی گئی تھی۔ اس اندھیاری نے دلاور کا کام آسان کر دیا۔ دلاور نے اپنی پشت سے بندھا ہوا چھوٹا واٹر کولر اتارا، اس کا ڈبل ڈھکنا کھولا اور کولر کو پنجرے کے بالکل سامنے کر دیا۔ جونہی دلاور نے پنجرے کا دروازہ کھولا، پرندہ آگے بڑھا...... چند لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر کولر میں داخل ہو گیا۔ دلاور نے کولر کے دونوں ڈھکنے بند کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس واٹر کولر میں اتنی آکسیجن تو بہرحال موجود تھی کہ یہ نایاب پرندہ اگلے ایک گھنٹے تک زندہ سلامت رہ سکتا تھا۔

لڑکا بے ہوش تھا۔ اس کے زخم سے خون تو بہہ رہا تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ دلاور امید کر سکتا تھا کہ اسے بچا لیا جائے گا۔ واٹر کولر کو ایک بار پھر اپنی پشت سے باندھنے کے بعد دلاور نے پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور واپس چل پڑا۔ ابھی وہ ڈکیتوں کے اس ڈیرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی جھیل میں بھی نہیں اترا تھا لیکن اس کی چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگی تھی کہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو چکا ہے۔

☆☆☆

دلاور نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ بغیر کسی بڑے خون خرابے کے وہ ساجے جیسے خطرناک شخص کی کچھار میں گھس کر اس کو ایک ''زبردست چپت'' لگا آیا تھا اور گوہر مطلوب حاصل کر لیا تھا۔ وہ باز واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور اگر اس کی وجہ سے دو شلع دست و گریباں تھے تو بات سمجھ میں آتی تھی۔

باز کو شاہ زمان کے حوالے کرنے کے بعد دلاور ایک طرح سے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دلاور نے اس امر میں زیادہ دلچسپی نہیں لی کہ باز کہاں پہنچایا گیا، کس نے پہنچایا اور اس کے نتائج کیا نکلے۔ بس ایک دن پیر فضل کی زبانی اسے اتنا پتا چلا کہ پرندہ حضور چانڈیو کول گیا ہے اور وہ تنازعہ جو دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا تھا، اب تقریباً ختم ہے۔

اس واقعے کے بعد حویلی والوں کی نگاہ میں اور خاص طور سے شاہ زمان کے نزدیک دلاور کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک روز دلاور کو زبردست سرپرائز ملا۔ اسے شاہ زمان نے بلایا۔ وہ اس کی بیٹھک میں پہنچا تو وہاں اس کے کئی عام اور خاص ملازم موجود تھے۔ ان سب کے سامنے شاہ زمان نے دلاور کے شانے پر ایک خاص قسم کی شال رکھی اور چھوٹے چھوٹے شیشوں سے مزین ایک نہایت قیمتی ٹوپی اسے پہنائی گئی۔

''تم آج سے میرے ''کارِ خاص'' ہو۔'' شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سب حاضرین نے اسے مبارک باد دی۔ ''کارِ خاص'' کا لفظ حویلی میں دراصل اہم ترین ملازم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسے ایک طرح سے شاہ زمان کا مشیر اور ملازمین کا انچارج بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ ''اعزاز'' اس سے پہلے ٹیپو ٹریگر کو حاصل تھا مگر زخمی اور بیمار ہونے کے بعد ٹریگر کی کارکردگی وہ نہیں رہی تھی لہٰذا اسے آرام دیا جارہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ یہ آرام ٹیپو ٹریگر کو ہضم نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں ہی دلاور کو اندازہ ہوگیا کہ ٹریگر اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت چمکنے لگی ہے۔ بہر حال دلاور ایسی باتوں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ حقیقی معنوں میں اگر اس حویلی میں اسے کسی کی پروا تھی تو وہ صرف اور صرف سویرا تھی۔ سویرا بھی جانتی تھی کہ دلاور نے شاہ زمان کے کہنے پر خود کو ایک زبردست خطرے میں جھونکا ہے اور ساجے کے ڈیرے سے قیمتی باز نکال لایا ہے...... جس کے صلے میں اسے ''کارِ خاص'' بنایا گیا ہے۔ وہ اس صورتِ حال پر خوش تھی۔ شاہ زمان کی دوسری اچانک شادی نے سویرا کو کچھ دیر کے لیے بالکل مرجھا ڈالا تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس صدمے سے سنبھلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس جال میں کتنا بھی پھڑپھڑائے گی، خود کو زخمی کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پائے گی۔ ایک ناک کٹی عورت یہاں پہلے ہی موجود تھی، وہ دوسری بننا نہیں چاہتی تھی۔ کسی وقت سویرا سے دلاور کا آمنا سامنا ہوتا تو سویرا کی حسین آنکھوں میں دلاور کو اپنے لیے کئی خاموش سوال نظر آتے۔

وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھتی، کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں تنہا درخت کی طرح اکیلے ہو؟ کیوں کسی بچھڑی ہوئی کونج کی طرح دل گرفتہ ہو؟ کیوں اپنی زندگی کو سنبھالتے نہیں ہو؟ کیوں اپنے ویران گلشن کو آباد نہیں کرتے ہو؟ زندگی اتنی بے وقعت تو نہیں، اسے یوں برباد کیوں کررہے ہو؟

ان سارے خاموش سوالوں کا دلاور کے پاس ایک ہی جواب تھا اور پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی دلاور کو یقین ہونے لگتا کہ وہ بھی اس جواب کے بارے میں جانتی ہے......

شاہ زمان اب دلاور کو اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا اور عموماً اس سے حویلی کے اہم معاملات میں مشاورت بھی کرتا تھا۔ ایک رات دیر تک وہ نشست گاہ میں دلاور کے ساتھ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ گفتگو کے دوران میں ایک بار پھر ساجے اور اس کے کرتوتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ دلاور نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑے سائیں! ایک سوال بڑے دنوں سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے۔ کافی عرصہ پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ دلاور، تم سے ایک خاص کام لینا ہے اس لیے حویلی میں ہی رہوں...... آپ نے کہا تھا نا......؟''

''ہاں کہا تھا...... اور کام لیا بھی تو ہے۔ تمہیں ساجے کے ڈیرے میں گھسایا اور تم نے وہ کر دکھایا جو شاید کوئی دوسرا نہ کر پاتا۔''

''یہی تو سوال ہے سائیں! آپ نے حویلی میں رہنے والی بات مجھ سے کافی عرصہ پہلے کہی تھی، اس وقت تو باز چوری نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی آپ کو یہ پتا تھا کہ اسے چوری کرنے والا اسے کہاں لے کر جائے گا......''

''مجھے پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی پتا تھا۔'' شاہ زمان ہولے سے مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

''سمجھو کبھی کبھار مجھے آنے والے وقت کا پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ جیسے الہام سا ہوجاتا ہے۔ میرے دل میں اچانک یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ فلاں کام ہوگا اور اس طرح ہوگا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ بات پختہ ہوتی جاتی ہے، بس ساجے مُغل والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا......''

اس نے اس سلسلے میں کچھ اور مثالیں بھی پیش کیں۔ اس نے کہا کہ شروع میں جو جیپ والا حادثہ پیش آیا تھا، اس سلسلے میں بھی اس کے ذہن میں پہلے سے ایک بڑا مضبوط شک اور خوف موجود تھا۔ وہ ایک طرح سے غیب دانی کا دعویٰ کررہا تھا لیکن وہ غیب دان نہیں تھا...... کیونکہ اس واقعے سے بے خبر تھا جو اگلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والا تھا۔

اس رات شاہ زمان اور دلاور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاہ زمان نے بتایا کہ اس نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر سے بات کی ہے۔ کچھ دنوں تک ساجے کے خلاف ایک بڑا آپریشن ہوگا اور علاقے سے یہ ''بیماری'' دور ہوجائے گی۔ اس کے بعد کچے میں ایک دو بڑے رقبے خریدنے اور ان کو آباد کرنے کی راہ ہموار ہوجائے گی۔ اس کے ذہن میں اس حوالے سے ایک دو شاندار منصوبے تھے۔ وہ علاقے کی سیاست کے بارے میں بھی پُرجوش تھا۔ وہ ایک ایسے شخص پر سرمایہ کاری کرنے کا منصوبہ رکھتا تھا جو ایک صوبائی نشست آسانی سے جیت کر اس کے دستِ راست کا کردار ادا کرسکتا تھا۔ شاہ زمان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! میں تمہارے آنے والے دن بڑے چمکدار دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے اندر کوئی خاص بات ہے...... اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس حویلی میں

تمہارا صحیح مقام ملے۔“

دلاور ممنونیت سے سر جھکا کر رہ گیا تو شاہ زمان بولا۔ ”میں نے شیرو سے اور بالے سے کہہ دیا ہے۔ رائفلیں تیار رکھو۔ صبح ہم نے بصیرت پور کے میلے میں سور کے شکار کے لیے جانا ہے...... تم نے کبھی...... شکار کیا ہے...... سور کا......؟“

دلاور کے نفی کے جواب میں شاہ زمان بولا۔ ”بڑا مزے دار اور بڑا دل جگرے والا شکار ہوتا ہے یہ...... تمہیں یہ سب کچھ آنا چاہیے......“ پھر شاہ زمان آخری سگریٹ بجھاتا ہوا اٹھ گیا اور بولا۔ ”جاؤ آج جلدی سو جاؤ...... صبح شاید جلدی نکلنا پڑے۔“ شاید اسے خود بھی اپنی نئی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ کل سویرا سے ملنے کے بعد وہ حد سے زیادہ مضطرب تھا۔ آج نیند کہاں آنی تھی...... آج بہت دنوں بعد اس کا رخ پستہ قد بیریوں کی جانب ہو گیا۔ وہ اپنی جائے پناہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ ریت کے بلند ٹیلے سے پار نہیں اترا تھا کہ ایک مخصوص سرسراہٹ، ایک ہلکے شور نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ یکایک اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں...... اس کے سر سے عین اوپر تارے جگمگا رہے تھے مگر مشرق کے افق کی جانب تارے ناپید تھے اور اس کی جگہ سیاہی اور دھول سی تھی۔ دلاور کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ریت کا طوفان تھا۔ ایسا ہی ایک طوفان پہلے بھی آیا تھا۔ وہ سرعت سے واپس پلٹا اور اس نے حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے اس نے کندھے پر رکھا کپڑا اڈھانے کی صورت چہرے اور سر پر لپیٹ لیا۔ اس کے حویلی میں داخل ہونے اور کمرے میں پہنچنے تک ریتیلا طوفان شروع ہو گیا۔ کھڑکیاں دروازے بجنے لگے۔ ہوا سیٹیاں بھرنے لگی۔ ظفری بے خبر سو رہا تھا۔ دلاور بستر میں دبک کر بیٹھ گیا۔

ہوا میں ایسی آوازیں تھیں جیسے بہت سی عورتیں کہیں بین کر رہی ہوں۔ بین کی آوازیں ہمیشہ اسے پریشان کرتی تھیں۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بھی عورتوں نے بہت بین کیے تھے۔

تب سے وہ بین کی آوازوں پر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے کانوں پر دونوں ہاتھ جما دیے تھے۔ چند منٹ تک ایسی کی چلتا رہا پھر ہوا کا شور رک گیا...... اس نے کھڑکی کھول دی اور جالی کے ساتھ منہ لگا کر باہر کے ماحول کا اندازہ لگانے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کسی کے چلانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اس نے اسے واہمہ جانا...... مگر ایک مختصر لمحے کے بعد آواز میں شدت آ گئی...... وہ کسی بچے یا کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں۔ دلاور چھلانگ لگاتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا، رائفل اتار کر ہاتھ میں لی اور باہر دوڑتا چلا گیا...... آندھی تھم چکی تھی مگر ہوا ہنوز چل رہی تھی۔ وہ جوں جوں آواز کی سمت چلتا گیا۔ رونے اور واویلا کرنے کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ یہ کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں جو حویلی کے کسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ دلاور کے پاؤں بجلی کی سی تیزی سے اٹھنے لگے۔ ابھی وہ کوریڈور میں پہنچا تھا کہ کوئی وزنی چیز اس کے کندھے سے اس زور سے ٹکرائی کہ رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ کوئی اٹھائیس تیس سالہ جوان تھا جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ صاف، آنکھوں میں سرمہ اور سر پر تلے والی ٹوپی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ سرمہ لگی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور وار سیدھا دلاور کے سینے پر کیا۔ دلاور نے خنجر والی کلائی پکڑ لی پھر اپنی ٹانگ کا وار اس کے پیٹ پر کیا۔ وہ اچھل کے گرا اور دوہرا ہو گیا۔

خنجر ابھی اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ہمت کر کے دوبارہ کھڑا ہوا، بے دریغ خنجر چلاتے ہوئے ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا...... دلاور واپس پلٹا۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ ابھی وہ حملہ آور کی طرف سیدھی کرنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ حملہ آور بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں دلاور کی طرف دیکھا پھر خنجر سے اپنی شہ رگ کاٹ لی۔ وہ دو چار قدم چلا پھر کوریڈور کے چپس لگے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں حویلی کے ملازمین جاگ چکے تھے اور بھاگم بھاگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف ہلچل سی تھی۔ دلاور کوئی موقع ضائع کیے بغیر اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں سے ابھی تک رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آواز کا اندازہ لگاتا ہوا دلاور ایک کمرے کے پاس پہنچ گیا...... دروازہ کھلا ہوا تھا اور رونے کی آوازیں اندر سے آ رہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کا اندرونی منظر لرزا دینے والا تھا۔ شاہ زمان آدھا بیڈ پر اور آدھا کارپٹ پر تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور انتڑیاں باہر نکلی پڑی تھیں۔ بیڈ کا ایک کونا خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ کارپٹ کا ایک حصہ بھی خون سے لتھڑ چکا تھا۔ نئی نویلی کم سن دلہن کا گلا رو رو کر بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ ہذیانی انداز میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر اُدھر بکھری چیزوں کو

موسم گرما کی طویل دوپہروں کا ساتھی..... خوشگوار تحریروں سے سجا جون 2017ء کا دل خوش کن پاکیزہ
کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ
رفعت سراج و شیریں حیدر کے خوب صورت ناول انوکھے موڑ پر
سحر ساجد کے قلم سے ایک اچھوتی تحریر من جاں بازم
سیما رضا ردا نے وا کیے کچھ نئے باب اپنے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُرنور مضمون اللہ اور اس کا نور
شوبز کی دنیا سے اجنبی، اجو بھائی کرتے ہیں کچھ انکشافات پاکیزہ کے مہمان میں
ناہید سلطانہ اختر کی تحریر
رسائی نارسائی میں انوکھی محبت
کا قصہ بہت ہی پُراثر انداز بیاں کے ساتھ
اس کے علاوہ
نیلم احمد بشیر، بشریٰ سیال اور فرحین اظفر کی خصوصی تحریریں
اور
عقیلہ حق، عذرا آفتاب، فرح طاہر قریشی، نسرین جمیل سیال،
سیما بنت عاصم و دیگر ہر دلعزیز لکھاریوں کی بے حد عمدہ کہانیاں
ماہ جون کی مناسبت سے دل پذیر سلسلے، دل گداز شاعری، پُرکشش کارنر ز اور خوش ذائقہ تراکیب صرف آپ کے لیے

دیکھ رہی تھی۔ دلاور نے اس چھوٹی سی عمر کی دلہن کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکال دیا۔ کمرے سے باہر عورتوں کا جمگھٹا لگ چکا تھا، پھر کچھ عورتیں سراسیمہ حالت میں کمرے میں داخل ہوگئیں۔ اچانک جیسے کلیجا پھاڑ دینے والے بین شروع ہوگئے۔

دلاور کی آنکھوں میں نمی تھی۔ چوڈیرو حویلی کا بڑا سائیں اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ جو رات کو شکار کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور دلاور کے آنے والے کل کے لیے پیش گوئیاں کررہا تھا، اپنے کل سے کتنا بے خبر تھا۔ وہ بے خبر انسان آج دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ یہ ساری کہانی مختصراً یوں تھی...... جس کم سن خوبرو لڑکی کو شاہ زمان اپنی دلہن بنا کر لایا تھا، اسی کا منگیتر بنوں سے چلا آیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر حویلی میں گھسا تھا۔ سوچے ہوئے منصوبے کے تحت اس نے شاہ زمان کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنی منگیتر کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی کے شور مچانے اور مزاحمت کرنے پر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں اس کا ٹاکرا دلاور سے ہوگیا تھا۔ دلاور سے لڑائی کے دوران اس نے اپنی شہ رگ کاٹ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا تھا۔ شاید اسی لڑکے کی وجہ سے لڑکی کے والدین چاہتے تھے کہ شاہ زمان جلد سے جلد برات لے کر آجائے۔ وہ ساری گفتگو دلاور کے ذہن میں گونجنے لگی۔ شاہ زمان نے ایک دن سویرا سے کہا تھا۔ ''عورتیں خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی ہیں مگر وہ اصل میں احمق ہوتی ہیں، تمہارے جیسی......'' اس نے سویرا کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تھا۔

وہ عورت تھی، کمزور تھی۔ وہ تب خاموش رہی تھی۔ نوعمر دلہن کے حویلی میں آنے سے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی مگر آج وہی دلہن شاہ زمان کی موت کا سبب بن گئی تھی۔ آج کوئی غائبانہ آواز کہہ رہی تھی... مرد خود کو بہت دانا اور سمجھ دار سمجھتے ہیں مگر ان میں سے بھی کچھ احمق ہوتے ہیں۔ تمہاری طرح۔ ''شاید'' یہی مکافاتِ عمل تھا۔ کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے ختم ہوئی تھی کہانی اس حویلی کے وڈے سائیں کی۔ دلاور کو یقین نہیں آرہا تھا...... کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

ہوائیں بدل گئی تھیں، موسم بدل گیا تھا۔ روہی سے آگے جو کیکر کے درخت تھے، ان پر بور آنا شروع ہوگیا تھا۔ اب روہی کی جانب سے چلنے والی ہواؤں میں ٹھنڈک ہوتی تھی۔ شاہ زمان کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ چھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ شاہ فرمان ''بڑے سائیں'' کی ''گدی'' سنبھال چکا تھا۔ پیر فضل اکثر علیل رہتے تھے۔ خاوند کی موت کا شدید صدمہ سہنے کے بعد سویرا اب سنبھلنا شروع ہوگئی تھی۔ نوعمر بیوہ اپنے وارثوں کے پاس واپس جاچکی تھی۔

دلاور حویلی کا کارِ خاص ہونے کے ناتے تمام حویلی والوں کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا۔ وہ پھر سے باتونی اور ہر ایک کا دل بہلانے والا بن چکا تھا مگر اندر تو وہی اندھیرے تھے۔ اب بھی جب گھٹن حد سے بڑھ جاتی تھی، ... رات کے اندھیرے میں، جب روہی کی فضائیں سوتی تھیں۔ حویلی کے مکین خواب خرگوش کے مزے لوٹتے تھے، وہ پستہ قد بیریوں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ نشہ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ عرصہ پہلے سویرا کو لکھا ہوا خط آج بھی اس کی پاکٹ میں موجود تھا۔ وہ خط جو اپنی ''منزل'' پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ آج بھی اپنی نارسائی پر روتا ہوا پلاسٹک کے کور میں محفوظ تھا۔ وہ خط دلاور نے پہلے دن سے خود سے جدا نہیں ہونے دیا تھا...... اور...... وہ کیسے ہونے دیتا۔ اس پرانے خط میں اس کی سانسیں قید تھیں۔ اس خط کو اس کی موت کے بعد ہی منظرِ عام پر آنا تھا۔ وہ اکثر رات کے سناٹے میں بیریوں کے نیچے بیٹھا سویرا کی لکھی ہوئی نظم دہراتا تو اسے یوں لگتا کہ سویرا اسے بہت پہلے سے جانتی ہے۔ شاید سیکڑوں...... شاید ہزاروں سال پہلے سے ...... جب اس روہی کی جگہ بستیاں آباد تھیں۔ وہ انہی بستیوں کے کسی نیم تاریک گھر کے کسی ویران کونے میں بیٹھ کر اپنے ''محبوب دلاور'' کے لیے ایک نظم تخلیق کرتی ہے اور وہ اشعار لکھتے وقت نہیں جانتی کہ ہزاروں سال بعد یہاں کوئی بستی نہیں ہوگی...... صرف اور صرف ریت ہوگی اور روہی کی بیکراں وسعتیں ہوں گی...... اور رات کی خاموش تنہائی میں جب سارا جگ سوتا ہوگا کوئی دلاور پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھا یہ اشعار دہرا رہا ہوگا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے......
صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ اَن دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ اَن دیکھے سے سائے ہیں
جو سنگ سنگ میرے چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں

اک گرم دو پہر کی مستی میں
اِک خام خیال سی مستی میں
کچھ اَن چھوئے سے جذبے ہیں
اَن جانے سے موسم ہیں
جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے!

سویرا اسے بھولنے کا کہتی تھی۔ وہ بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی سانسوں میں، اس کی نس نس میں سویرا سما چکی تھی۔ ایک عورت کی جدائی اس نے روتے ہوئے برداشت کرلی تھی مگر تب وہ چھوٹا تھا، ناسمجھ تھا مگر اب کی بار وہ دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ ماں بچے کو چھوڑ کر جانے لگے تو وہ روتے ہوئے اس کا دامن تھام لیتا ہے، بلکتے ہوئے آسمان سر پر اٹھالیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی بچہ بن چکا تھا۔ ہر رشتے سے محروم دلاور سویرا کو اپنی نگاہوں سے دور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ اور نہیں چاہتا تھا۔ بس اس کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ بس ایک فاصلہ رکھ کر اس کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

ٹیپو ٹریگر صحت یاب ہو کر حویلی میں آچکا تھا۔ وہ شاہ فرمان کا بہت خاص اور لاڈلا تھا۔ حویلی میں جو کچھ ہو رہا تھا، دونوں دیکھ رہے تھے۔ دلاور یہاں ہر دلعزیز تھا۔ حویلی کے مکین اس سے بے حد خوش تھے اور خاص طور سے سویرا کی نوازشیں تو بے انتہا تھیں۔ سویرا اس سے یوں رویہ رکھتی تھی جیسے وہ حویلی کا ملازم نہ ہو بلکہ کوئی بہت قریبی رشتے دار ہو۔ شاہ فرمان کو یہ باتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ ایسے موقعوں پر کچھ کر نہیں سکتا تھا، صرف جل بھن کر رہ جاتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سویرا ہمیشہ سے من موجی ہے اور وہی کرتی ہے جو اس کے دل میں آتا ہے۔ سویرا ایک پڑھی لکھی ہوش مند لڑکی تھی۔ شاہ فرمان اس پر زیادہ سختی کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ ورنہ حویلی کی عام عورتوں کے حوالے سے وہ بڑا سنگدل تھا۔ چند دن پہلے اس نے اپنی ایک جوان ملازمہ کو پانچ گھنٹے کے لیے ایک کتے کے ساتھ ''ڈاگ ہاؤس'' میں بند کر چھوڑا تھا۔ ملازمہ کا خوف سے جو حال ہوا، بیان سے باہر تھا۔ ملازمہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے شاہ فرمان کے اس لاڈلے کتے کو باورچی خانے میں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی...... شاہ فرمان من پسند ملازماؤں سے تعلقات استوار کرنا بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔

ایک دن تنہائی میں شاہ فرمان ٹریگر سے بولا۔ ''تو دل چھوٹا نہ کر...... میں نے کچھ سوچا ہے اور بہت جلد ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔''

''بڑے سائیں! دلاور بڑا چالباز ہے۔ اس نے سویرا بی بی کو اپنے ہاتھوں میں کیا ہوا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں......لوگ باتیں بنانا نہ شروع ہو جائیں۔''

''میں نے کہا نا......خود کو حوصلے میں رکھ...... یہ کام جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ ہر جگہ طاقت ہی مسئلے حل نہیں کرواتی......کبھی کبھی اس سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔'' شاہ فرمان اپنی انگلی کنپٹی سے ٹکراتے ہوئے بولا۔

''تو کیا...... دلاور...... کو باہر...... باہر سے...... ہی......'' ٹیپو ٹریگر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''او نہیں اوئے......تو بھی کسی سورنی کا بچہ ہے۔ ہر وقت......خون خرابا......قتل و غارت۔ میں نے پہلے بھی تجھے کہا ہے۔ ہوش سے کام لے......دلاور کو چاچا پیر فضل کی تھپکی بھی ہے۔ ان کو کسی گڑبڑ کا پتا چل گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''تو پھر......آپ کے دل میں کیا ہے؟''

''کل کا دن انتظار کر میں پرسوں تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔'' شاہ فرمان کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ٹیپو ٹریگر ان آنکھوں کی کہانی پڑھ رہا تھا۔

سویرا دلاور سے ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ دلاور انجان تھا...... وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سویرا اس کے احساسات سے لاعلم ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں سویرا نے اس کی الماری کی تلاشی لی تھی اور وہاں سے برآمد ہونے والے رومال...... گھڑی...... ٹوٹی چوڑیوں...... اور ایک ورق پر لکھی ہوئی نظم نے سارے راز کھول دیے تھے...... یہ چیزیں اس کا پول نہ بھی کھولتیں تو ایک عورت کی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ دلاور کے دل میں کچھ ہے۔ سویرا دلاور کے لیے جو کچھ کر رہی تھی، اس کی وجہ یہی رہی تھی۔ اس کے دل میں ابھرنے والے انجان جذبے جب زور پکڑتے تھے اور وہ جو ایک دل کے نہاں خانے کی ندی تھی، اس کے پانیوں میں خوفناک اچھال پیدا ہوتا تھا تو وہ حد سے زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔ متضاد کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی...... وہ سر تھام کر بیٹھ جاتی تھی...... بھیانک چیخیں اس کے وجود میں گونجنے لگتی تھیں...... خود کو مجرم عظیم سمجھنے لگ جاتی تھی...... جب جب ایسی حالت ہوتی تھی، تب تب وہ نماز پڑھتی تھی۔ کفارے کے طور پر دلاور کی بے پناہ دل جوئی میں لگ جاتی تھی لیکن ساتھ ساتھ ڈرتی بھی تھی کہ لوگ غلط مطلب نہ لینے

لگیں۔ وہ بھی ایسی ہی ایک شب تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ آنسو بھی اس کی خاموش محبت کی طرح نہ سمجھ آنے والے تھے۔ وہ ایسی محبت کا شکار ہو چکی تھی...... جس کی اسے خود بھی خبر نہ تھی اور اگر تھی بھی...... تو اس پر معاشرتی جبر کا اتنا موٹا اور دبیز پردہ پڑا ہوا تھا کہ پہچان ناپید تھی۔

اس نے آنسو پونچھے اور ایک ڈائری نکال لی جس پر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظم درج تھی...... تم کب تک مجھ کو بھولو گے۔

وہ نظم دہرانے لگی۔ اچانک ساتھ والے کمرے میں کھٹکا ہوا...... پہلے اس نے وہم جانا...... مگر دوبارہ آہٹ ہونے پر وہ اٹھی اور دبے پاؤں دروازے تک گئی۔ جس دروازے پر سویرا کھڑی تھی، وہ جڑواں کمروں کا درمیانی دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ اس دروازے میں تھوڑی سی درز موجود تھی۔ سویرا ڈرتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر باہر نگاہ دوڑائی...... باہر مہیب سناٹا اور روہی کی جانب سے آنے والی مدھر ہوا تھی...... اس نے دل میں سوچا شاید وہ رات کو دروازہ لگانا بھول گئی ہے۔ اس نے کنڈی چڑھائی اور واپس پلٹی۔ ابھی وہ چار پانچ قدم ہی چلی تھی کہ الماری کے پیچھے سے ایک ہیولا برآمد ہوا۔ وہ ایک ڈھاٹا پوش تھا۔ اس نے اپنا سر، کان، چہرہ ایک موٹے کالے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے اشارے سے سویرا کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ خوف سے سویرا کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں...... سخت گھبراہٹ کے عالم میں سویرا کی نگاہ ڈھاٹا پوش کے عقب میں پڑی جہاں ایک کالے رنگ کا تھیلا...... زیورات اور نقدی سے بھرا ہوا تھا۔ ساری بات سویرا کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چیخی...... ڈھاٹا پوش بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھا...... وہ پچھلے قدموں پلٹی اور بھاگی...... ڈھاٹا پوش نے ایک جست لگاتے ہوئے اسے دبوچ لیا...... سویرا بری طرح چیخنے چلانے اور ہاتھ پیر مارنے لگی۔ وہ اس کی گرفت سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ بند کرنا چاہ رہا تھا۔ سویرا نے کئی تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیے اور ناقابلِ یقین انداز میں اسے ایک دھکا دیا...... وہ دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا...... وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ ڈھاٹا پوش نے اسے عقب سے تھام لیا اور اٹھا کر بیڈ پر پھینکا۔ سویرا کے ہاتھ میں شیشے کا لیمپ آ گیا۔ اس نے گھما کر ڈھاٹا پوش کے سر پر وار کیا۔ وہ جھکائی دے کر سر بچا گیا...... شیشے کا لیمپ اس کے کندھے پر لگ کر چکنا چور ہو گیا۔ وہ دوسرا لیمپ بھی آزمانا چاہتی تھی کہ وہ جست لیتا ہوا بیڈ پر چڑھ گیا۔ اس نے لیمپ سویرا کے ہاتھ سے چھینا اور دو تین تھپڑ جڑ دیے۔ وہ چکرا کر اس کے ساتھ آ لگی...... ڈھاٹا پوش غصے سے دیوانہ ہو چکا تھا۔ شیطانی حس بیدار ہوئی اور وہ سویرا پر پل پڑا۔ وہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ سویرا کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ لانبی نسواری زلفیں بکھر کر منتشر ہو گئیں۔ اس کی پیش قدمی نہیں رکی۔ سویرا اسے خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ مگر وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سویرا کو نیچے گرا لیا تھا...... وہ چیخ رہی تھی۔ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اسی دوران باہر کا دروازہ بجنے لگا۔ ڈھاٹا پوش اپنی جگہ پر ٹھٹکا۔ پھر اس نے سویرا کو چھوڑ دیا۔ بڑی سرعت سے دوسرے کمرے میں گیا۔ نقدی اور زیورات والا تھیلا اٹھایا اور دوسری طرف والا دروازہ کھول کر کسی چھلاوے کی طرح تاریکی کا حصہ بن گیا۔

دروازہ دھڑ دھڑانے والی بڑی آپا تھیں۔ سویرا نے دروازہ کھولا۔ بڑی آپا اندر آئیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سویرا کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ بڑی آپا نے کلیجا تھام لیا۔ چیختے ہوئے بولیں۔ ”سویرا! کیا ہوا ہے تجھے؟“

سویرا جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بڑی آپا کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ صبح تک یہ خبر پوری حویلی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کہانی تھی کہ رات سویرا بی بی کے کمرے میں کوئی بندہ گھسا تھا۔ پہلے اس نے تجوری خالی کی۔ اس کے بعد سویرا بی بی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔

وہ تو شور شرابے سے بڑی آپا کی آنکھ کھل گئی اور وہ موقع پر پہنچ گئیں...... نہیں تو...... سویرا بی بی کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا...... بہت بڑا۔

شاہ فرمان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ہر قیمت پر اس بندے کو ڈھونڈ نکالوں گا...... اور پھر ایسی سزا دوں گا کہ اس کی اگلی پچھلی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس نے حویلی کی بہو کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اپنی قبر خود کھودی ہے۔ ڈکیتی سے اگلے دن شاہ فرمان نے دو نہایت

السلام علیکم

ہمیں اپنے نئے بلاگ (ویب سائیٹ) کے لئے رائٹرز کی ضرورت ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی ممبر ناول، افسانہ، ناولٹ لکھنا چاہے تو ہم سے کانٹیکٹ کر سکتے ہیں۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتہ کے اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ہمیں ای۔ میل کریں یا ان بکس میں میسج کریں۔

شکریہ

Email Address: - aatish2kx@gmail.com

تربیت یافتہ کھوجی بلالیے...... آتے ہی انہوں نے اپنی تفتیش کا آغاز کردیا۔ صدر دروازے کے محافظین کے مطابق ڈکیت باہر سے نہیں آیا تھا۔ دو گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد کھوجیوں نے صدر دروازے کے محافظین کی بات کی تصدیق کردی...... ڈکیت حویلی کے اندر ہی موجود تھا۔ کھرا ڈھونڈتے ہوئے انہیں ایک پرانا لائٹر...... ایک سرخ رنگ کا بال پوائنٹ ملا تھا۔ شاہ فرمان نے حویلی کے تمام داخلی دروازوں کو بند کروادیا تھا۔ اس کا کہنا تھا جب تک تفتیش مکمل نہیں ہوجاتی، حویلی کا کوئی بندہ باہر نہیں جائے گا...... ڈکیت کوڈھونڈنا شاہ فرمان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ حویلی کو سیل کردیا گیا...... کھوجیوں نے اپنا ایک اور ساتھی بہاولپور سے بلوالیا۔

شاہ فرمان نے حویلی کے نچلے درجے کے تمام ملازمین کو ایک کمرے میں اکٹھا کرلیا۔ دہاڑتے ہوئے بولا۔"اوئے کتے کے پترو...... مجھے صاف صاف بتادو...... یہ کام کس کا ہے...... بندہ تو میں نے ڈھونڈ ہی نکالنا ہے۔ اگر خود بتادو گے تو سزا کم اذیت ناک ہوگی...... ورنہ تم سور کے تخم مجھے اچھی طرح جانتے ہو...... دندوں والی چھری سے کھال اتروادوں گا میں تمہاری سب کی...... بولو اوئے...... جواب دو کوئی......" شاہ فرمان نے ایک دو کے منہ پر تھپڑ جڑ دیے۔ ایک کے زیر ناف ایسی ٹانگ ماری کہ وہ دہرا ہوگیا۔ ٹیپو ٹریگر بھی ان پر پل پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو چار کے منہ پھٹ گئے۔ ایک ملازم آنکھ پہ ہاتھ رکھ کر بے تحاشا چلانے لگا۔ شاہ فرمان دوبارہ گرجا۔"اوئے ننگا کرو اوئے ان سب کو...... میں ان کی ماں کی......"

پانچ چھ ملازمین جو ان میں تگڑے تھے، ان کے کپڑے اتروالیے گئے۔ صرف جسم پر ایک انڈرویئر رہنے دیا گیا۔ الٹا لٹکا کر ٹیپو ٹریگر انہیں بید کے ڈنڈے سے پیٹنے لگا۔ ان کی چیخ و پکار سے دلاور کا دل گھبرانے لگا، آدھ گھنٹے تک بہیمانہ تشدد چلتا رہا۔ کسی نے اعتراف جرم نہیں کیا۔

شام نے ابھی اپنے پر نہیں پھیلائے تھے۔ روہی کی طرف سے اٹھنے والی ہواؤں میں ابھی ہلکی سی حدت برقرار تھی۔ کھوجیوں نے شاہ فرمان کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ سگار کے کش لیتا ہوا وہاں پہنچا تو ایک اہم خبر اس کی منتظر تھی...... کھوجیوں نے انتھک محنت کرکے ڈکیت کے جوتی کے نشانوں کا کھرا ڈھونڈ نکالا تھا اور ان نشانوں کی نشاندہی حیرت انگیز طور پر ٹیپو ٹریگر نے کی تھی۔ وہ حویلی کا پرانا نمک حلال تھا۔ ایسے معاملات میں اس کی حس بے حد تیز تھی۔ یہ پشاوری جوتی کے نشان تھے جو کوریڈور سے نکلتے ہوئے باغیچے میں آئے تھے۔ پھر درختوں سے پرے چلے گئے تھے۔ کھوجیوں نے سفوف ڈال کر ان نشانات کو مزید واضح کرلیا تھا۔

اگلا مرحلہ نہایت اہم اور دلچسپ تھا۔ حویلی کے تمام ملازمین کی جوتیاں ایک جگہ اکٹھی کرلی گئیں۔ یہاں تک کہ دلاور اور ٹیپو ٹریگر کی جوتیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ ایک گھنٹے کی مزید عرق ریزی کے بعد نتیجہ صفر نکلا...... کسی جوتی کے تلے کا ڈیزائن مطلوبہ نشانوں پر پورا نہیں اترا......

شاہ فرمان عجیب کشمکش کا شکار ہوگیا۔ وہ پریشانی سے پیشانی مسلنے لگا۔ دلاور اور ٹیپو ٹریگر اس کے قریب کھڑے تھے۔ وہ دھیرے سے ان سے مخاطب ہوا بولا۔"کہیں وہ بندہ حویلی کے باہر سے تو نہیں آیا تھا؟"

دلاور نے شاہ فرمان کے خدشے سے اتفاق کیا مگر ٹیپو ٹریگر...... ایک نہایت ہوشیار اور تیز رفتار آدمی کا نام تھا۔ جھٹ سے بولا۔"بڑے سائیں! سب ملازمین کے کمروں کی تلاشی لی جائے، کیا پتا...... مطلوبہ جوتی کہیں سے برآمد ہوجائے۔" ٹیپو ٹریگر کی بات پر شاہ فرمان یوں چونکا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ اس نے تعریفی نظروں سے ٹیپو ٹریگر کی جانب دیکھا پھر اگلے چند منٹوں میں ٹیپو ٹریگر کے دیے ہوئے مشورے پر عمل شروع ہوگیا۔

تین کھوجی اور حویلی کے چار بڑے ملازمین حویلی میں ملازمین کے ہر کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ جوتی دلاور کے کمرے کی الماری کے عقب سے برآمد ہوگئی...... ظفری پچھلے ایک ہفتے سے کراچی میں تھا۔ اسے شاہ فرمان نے کسی ضروری کام سے وہاں بھیجا ہوا تھا۔

زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھوم گئے...... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولا۔"یہ...... یہ کیا ہے......؟"

"یہ وہ چپل ہے جس کی تلاش میں ہم سب مارے مارے پھر رہے ہیں۔" ٹیپو ٹریگر غصیلے لہجے میں بولا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے کھوجی کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا بڑا پرچہ جھٹکے سے چھین لیا۔ جس پر زمین پر جابجا نمودار ہونے والے "فٹ پرنٹ" کو کاپی کیا گیا تھا۔ ادھیڑ عمر شاہ فرمان کے ماتھے پر کئی سلوٹیں نمودار ہوچکی تھیں۔ وہاں موجود سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ٹیپو ٹریگر نے جوتی کا ایک پیر "فٹ پرنٹ" پر رکھ دیا۔ جوتی کا وہ پیر پورا پورا "فٹ پرنٹ" پر بیٹھ گیا۔

شاہ فرمان کا رخ اب دلاور کی جانب تھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے...... پھنکارتے لہجے میں بولا۔

"اوئے...... یہ...... سب کیا ہے...... یہ جُتی تیری ہے۔"

"بڑے سائیں! یہ جوتی میری ہی ہے...... مگر یہ یہاں کیسے آئی...... میں نہیں جانتا...... میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"اوئے پر یہ جُتی...... یہاں کیا انڈے دے رہی ہے۔" شاہ فرمان حلق کے بل چیخا۔

"بڑے سائیں! مجھے پھنسایا جا رہا ہے۔ میں اس حویلی کا نمک حلال ہوں...... اس حویلی کے لیے میں اپنی جان پر بھی کھیلا ہوں۔ میں...... بھلا یہ سب کیسے کر سکتا ہوں...... آپ کی سوچ پر افسوس ہو رہا ہے۔"

"اوئے میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ تو ہے کیا...... تو نے کب سے اس گھر کی عزت پر آنکھ رکھی ہوئی ہے۔ اوئے میں تیری آنکھیں چھرے سے نکال کر زمین پر ڈال دوں گا۔"

ٹیپو ٹرنگر جوشیلے انداز میں دھاڑتے ہوئے آگے بڑھا تو شاہ فرمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ بولا۔

"اوئے نہیں اوئے......! اسے اپنی صفائی کا موقع ملنا چاہیے...... اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا ہے۔"

دلاور کا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دم توڑ گئی تھیں۔

حویلی کے تمام داخلی اور خارجی دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ تفتیش نے جو نیا رخ اختیار کیا تھا، اس نے سب کو حیران کر رکھا تھا۔ دلاور باری باری حویلی کے سب بڑوں کے پاس گیا۔ شاہ فرمان، پیر فضل، بڑی آپا...... اس نے سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ تو اس حویلی کے لیے اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ وہ طرح بھی کیسے سکتا ہے کہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت کرے۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ "آپ جانتی ہیں مجھ سے پہلے ٹیپو ہی حویلی کا "کارِ خاص" تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اللہ بخشے شاہ زمان صاحب نے یہ ذمے داری مجھے دے دی۔ ٹیپو اور اس کے ساتھیوں نے دل میں میرے لیے رنجش پالی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

بڑی آپا نے کہا۔ "میں جانتی ہوں تم ایسے نہیں ہو۔ تم نے حویلی کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ پر اب...... جو کچھ سامنے آ رہا ہے اس کا کیا مطلب لیا جائے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ابھی ملازم فرزند نے بتایا ہے کہ تمہارے کمرے میں سے شراب کی بوتلیں بھی نکلی ہیں۔ کئی ایک نے گواہی دی ہے کہ تم کبھی کبھی اتنا نشہ کرتے ہو کہ تم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے اسی نشے میں کیا ہے۔"

وہ بولا۔ "بڑی آپا! میں آپ کو ماں کی طرح سمجھتا ہوں، یقین کریں ایک عرصے سے میں نے اس گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ایک چھوٹا سا دور آیا تھا جب میں نے پریشانیوں سے گھبرا کر اس منحوس چیز کا سہارا لیا تھا لیکن اب تو......"

اچانک دلاور کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک اندرونی کمرے سے سویرا نکلی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی...... رنج وغم کی تصویر...... آنکھیں سوجی ہوئیں۔ اس نے دلاور کی طرف نہیں دیکھا۔

دلاور نے جیسے تڑپ کر کہا۔ "بب...بی بی جی۔ آپ ہی بتائیں۔ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ مجھ پر جو الزام لگایا جا رہا ہے، وہ درست ہو سکتا ہے؟ آپ اپنے دل سے پوچھیں...... آپ کا دل کیا کہتا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آپ کا دل جو بھی کہے گا وہ میں مان لوں گا۔ چاہے وہ گناہ میں نے کیا ہو یا نہ کیا ہو۔"

وہ عجب دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "میں کیا کہوں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ میں اندھی، گونگی اور بہری ہو چکی ہوں۔ میرے بارے میں جو کچھ بھی کہنا یا کرنا ہے، دوسروں نے کرنا ہے۔" وہ سسکی اور ایک دم پلٹ کر واپس چلی گئی۔

وہ رات دلاور نے جاگ کر گزار دی۔ جب وہ حد سے زیادہ پریشان ہوتا تھا تو...... روہی میں بلند ٹیلے سے پار پستہ قد بیریوں کے پاس چلا جایا کرتا تھا مگر حویلی کے کرتا دھرتاؤں نے آج اس سے یہ حق بھی چھین لیا تھا، کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھٹن بڑھنے لگی تو وہ باہر نکل گیا۔

اس کا رخ سیبوں والی حویلی کی جانب ہو گیا۔ سیبوں والی حویلی کے اندر ایک بلند گھاٹی سی تھی جس پر بیٹھ کر روہی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ رات کے اس پہر اس گھاٹی پر پہنچ گیا۔ وہ وہاں بیٹھ کر پستہ قد بیریوں کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر حویلی سے باہر مہیب تاریکی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جس طرح حویلی کے لوگوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا، آج دشت کے نظارے اور پستہ قد بیریوں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ جیسے آپس میں سب ملے ہوئے تھے۔

وہ وہاں بیٹھا رہا۔ شاید ایک گھنٹا، شاید ڈیڑھ دو گھنٹے۔ صرف اجنبی سناٹے ہی تھے جو اس کے دل کی زبان پڑھ رہے تھے...... اور کیوں نہ ہوتے...... وہ اس کا پہلا عشق جو تھے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ کسی نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر نگاہ اوپر اٹھائی تو وہ حویلی کا ملازم بالا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ اضطراب تھا بولا۔ ''چلو...... تمہیں بی بی جی بلا رہی ہیں۔''

''کون بی بی جی...؟'' دلاور نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سویرا بی بی نے تمہیں بلایا ہے۔'' وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ دلاور کے اندر یکایک امید کی کرن جاگی۔ اسے لگا کہ سویرا کی طرف سے اس کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آئے گا اور شکوک کے وہ سارے زہریلے بادل بکھر جائیں گے جو اس کی سانس روک رہے تھے۔

مگر جب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زنان خانے میں سویرا کے روبرو پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی منظر نظر آیا۔ آنسو سویرا کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور آنکھوں میں دنیا جہان کی دکھ آمیز حیرانی سمٹی ہوئی تھی۔ وہ عجب دردناک لہجے میں بولی۔ ''دلاور! میں اب بھی یقین نہیں کر پا رہی۔ مجھے اب بھی آس ہے کوئی ایسی بات سامنے آ جائے گی جو سارے حالات کو غلط ثابت کر دے گی......''

''آپ...... کن حالات کی بات کر رہی ہیں؟''

اس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ایک طلائی نیکلس دلاور کے سامنے کیا اور بولی۔ ''یہ بڑی آپا کی ملازمہ صفیہ سے ملا ہے۔ مار کھا کر اس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نیکلس بدھ کی رات تم نے اسے تحفے میں دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ بہاولپور چلے تم اسے عیش سے رکھو گے......'' آخری الفاظ کہتے کہتے سویرا کا گلا رندھ گیا۔

دلاور تڑپ کر بولا۔ ''یہ جھوٹ ہے...... سراسر الزام ہے۔ اسے...... میرے سامنے لائیں، مجھے اپنی مری ماں کی قسم ہے بی بی...... یہ سفید جھوٹ ہے، مجھے نہیں پتا۔ یا تو اس کڑی کو بہت مارا پیٹا گیا ہوگا...... یا اس نے لالچ میں آ کر یہ بیان دیا ہوگا...... آپ...... آپ مجھے یہ بتائیں، آپ کا اپنا دل کیا کہتا ہے؟ میں ایسا نیچ ہو سکتا ہوں؟ میں یہ سب کر سکتا ہوں......؟''

سویرا نے جیسے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں پریشانی، تذبذب اور رنج کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ اور کہتا، بڑی آپا تیزی سے اندر آ گئیں۔ بڑی آپا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ چلا کر بولیں۔ ''بس...... بس اب صفائیاں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہمیں تمہاری صفائیاں سننے کی ضرورت ہے۔ سب کچھ چٹے دن کی طرح سامنے آ گیا ہے...... سب کچھ......''

سویرا نے ذرا تعجب سے بڑی آپا کی طرف دیکھا۔

اسی دوران میں شاہ فرمان، پیر فضل اور ٹیپو ٹریگر وغیرہ بھی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ شاہ فرمان نے سویرا کو بتایا کہ اس کا سارا چوری شدہ زیور دلاور کے کمرے کے فرش سے نکلا ہے۔ اینٹیں اکھاڑ کر زیور وہاں دبایا گیا تھا اور اینٹیں دوبارہ بڑی صفائی سے جوڑ کر اوپر جستی پیٹی رکھ دی گئی تھی۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے کئی گہنے شاہ فرمان کے ہاتھ میں تھے۔

اس سے پہلے کہ دلاور اپنے دفاع میں کچھ کہتا بڑی آپا تیزی سے آگے آئیں اور ان کا زنانٹے دار تھپڑ دلاور کے رخسار پر پڑا۔ وہ بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ تھپڑ پڑنے کی دیر تھی کہ یکایک شاہ فرمان کے تنومند کارندے دلاور پر جھپٹ پڑے۔ وہی کارندے جن کا وہ ''کارِ خاص'' تھا۔ جو کل تک اسے سلام کرتے تھے، اس کا حکم مانتے تھے، اسے لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ بے دردی سے پیٹنے لگے۔

ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ بڑی آپا کی چلاتی ہوئی آواز جیسے کوسوں دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی ......''ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں۔''

ہاں اسے بے دردی سے مارا جا رہا تھا۔ اسے سویرا کے سامنے مارا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کے دوران میں اس نے ایک دو بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے پھر گرا دیا گیا۔ سر پر لگنے والی ضربات نے جیسے اس کی نظر کو دھندلا دیا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک سرخ دھند سی پھیل گئی تھی۔ سماعت سے وحشی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

''مار دو اسے...... جان سے مار ڈالو۔''

''ٹکڑے کر دو، کتوں کے آگے ڈال دو۔''

''پولیس کو بلاؤ...... ایس پی کو فون کرو۔''

''نہیں نہیں...... خود رسا ڈالو اس کمینے کی گردن میں......''

اور وہ دیکھ رہی تھی...... یقیناً دیکھ رہی تھی۔ رائفل کا ایک دستہ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں لگا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا احاطے میں جا گرا۔ وہ اسے غلیظ ترین گالیوں سے نواز رہے تھے۔ اسے مارتے اور گھسیٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اسے اس کمرے تک لائے جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ کمرے کا اینٹوں کا فرش کھدا پڑا تھا۔ ''یہ دیکھ حرامزادے ...... یہ ہیں تیرے کرتوت......'' شاہ فرمان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے دیکھا، اس کے سامان والا صندوق بھی اٹھا کر برآمدے میں پھینک دیا گیا تھا۔ سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ ایک دھکا کھا کر اپنے سامان کے اوپر ہی گرا۔ اس کا ہاتھ اس چوبی ڈبے سے ٹکرایا جس میں اس کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ اس نے جنونی سے انداز میں وہ ڈبا اپنے سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے اسے مارتے چلے گئے مگر وہ ڈبے کو تھامے رہا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ مارنے والے ہاتھوں میں سے کسی کی کوئی سخت چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی جس سے سر پھٹ گیا تھا اور خون پھٹی ہوئی شرٹ کے کالر کو بھگو رہا تھا...... پھر اس کے لڑکھڑاتے جسم کو بازوؤں سے تھام کر جیپ میں ڈالا گیا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ جیپ قریباً آدھا گھنٹا چلتی رہی۔ جیپ رکی تو اسے نیچے اتار لیا گیا۔ پاس ہی کہیں سے پانی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ جیپ سے اتار کر اسے پھر لاٹھیوں سے پیٹا جانے لگا۔ ایک لاٹھی اس کی کلائی پر پڑی تو ڈبا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر کر کھل گیا...... چیزیں بکھر گئیں۔ وہ دیوانوں کی طرح ان چیزوں کو سمیٹنے کے لیے جھکا تو اس پر لاٹھیوں، ڈنڈوں کی بارش ہوگئی...... وہ گھڑی کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو ہاتھ پر ڈنڈا پڑتا۔ رومال یا کاغذ کے ٹکڑے کو چھونا چاہتا تو ضربات سے ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑا جاتیں......

تم کب تک مجھ کو بھولو گے...... اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے...... اس نے ڈنڈے کھاتے ہوئے بھی رومال اور وہ پرچہ اپنے ہاتھ میں کر لیا مگر پھر ایک لاٹھی کی جان لیوا ضرب اس کے سر پر لگی تو اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا...... وہ مر چکا تھا یا مرنے والا تھا۔ بس کہیں دور بہت دور سے کچھ سرسراہٹیں سی تھیں۔ اس کے جسم کے ساتھ کسی رسا ٹائپ چیز سے کوئی وزنی شے باندھی جا رہی تھی۔ کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ ''اوئے شیرو! ایکسل ٹھیک طرح سے باندھ...... یہ کھل گیا...... تو یہ کمینہ پانی پر واپس اوپر آجائے گا۔'' یہ آخری آوازیں تھیں جو اس کے ڈوبتے ذہن میں سنائی دیں...... اس کے بعد یوں لگا کہ اس کا وجود پانی کے اندر کہیں نیچے گرتا چلا جارہا ہے۔ بہت سی ملی جلی سرگوشیاں پانی کے دباؤ میں ابھرنے لگیں۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے......

''چلو آج ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے میں اور تم اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے مجھے سویرا بی بی نہیں، صرف سویرا کہو گے......''

''دلاور! میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔ تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔''

''دلاور! تم خود کو اکیلا مت سمجھو...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں......''

''دلاور! میں نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ دیکھنا آنے والے دنوں میں تم حویلی کے بہت ہی خاص بندوں میں شمار ہوگے......''

''دلاور! میں تمہارے لیے کچھ الگ طرح سے سوچتی ہوں۔''

دلاور پانی کی تہ میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا... جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے مگر وہ زندہ کب تھا۔ وہ تو مر رہا تھا۔ فرشتۂ اجل کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ان جان لیوا لمحوں میں ایک کھڑکی سی دلاور کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے کھل گئی۔ یہ اس کے ماضی کی کھڑکی تھی...... گرمی کی چمکتی دوپہر تھی۔ لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے بائیں طرف ایک تنگ گلی اوپر کو چڑھتی تھی۔ بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں اور بوسیدہ مکانوں کا ایک گورکھ دھندا تھا۔ انہی تنگ گلیوں کے ایک بوسیدہ مکان میں جس کے برآمدے کے ایک کونے میں سنہری دھوپ اترتی تھی، وہاں پر ایک ٹوٹی چارپائی کو آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت ٹھیک کرتے ہوئے مسکراتی ہے...... کیونکہ سرفو دم گھٹ نے اس کی جھولی میں ایک ننھا بچہ لاکر ڈالا ہے۔

''لے سنبھال اسے...... صبح جب میں راوی پر گیا تھا تو ایک کشتی میں روتا ہوا ملا تھا یہ مجھے...... دوپہر تک اس کے مالکوں کو ڈھونڈتا رہا...... مگر کوئی نہیں ملا...... تو پال اسے...... تھوڑا بڑا کر اسے...... دیکھ...... پھر میں اسے کیسا ٹوبا بناتا ہوں...... لوگ سرفو کو بھول جائیں گے۔''

''دلاور پتر! جا بازار سے مجھے سبزی لادے......''

''آ میرا پتر ادھر...... تو نال والے پپو کے ساتھ نا کھیلا کر...... دیکھ تیرے پنڈے پر لاس ڈال دی ہے۔''

''ماں...... مجھے چاچا سرفو کے ساتھ نہیں جانا...... مجھے پانی میں ڈبکیاں دیتا ہے۔ میری ناک میں پانی گھس جاتا ہے۔ میری آنکھوں سے پانی بھی بہنے لگتا ہے۔ وہ مجھے بڑی دیر پانی میں رکھتا ہے......''

''میرا پت تو بڑا بہادر ہے۔ دیکھ دلاورے! دل چھوٹا نہ کریا کر...... تیرا چاچا تیرے بھلے کے لیے ہی سب کچھ کرت ہے۔ وہ تجھے کچھ سکھانا چاہتا ہے...... بنانا چاہتا ہے۔''

سرفراز عرف سرفو دم گھٹ جدی پشتی ٹوبا تھا۔ گہرے

پانیوں میں زیادہ سے زیادہ دیر رہنے کا فن نسل در نسل اس میں منتقل ہوا تھا...... اور اب وہ یہ فن ...... آٹھ سالہ دلاور میں منتقل کر رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے دلاور کو دوبارہ پانی میں غوطہ دیا۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چلانا چاہتا تھا مگر منہ کھولتا تو ڈھیروں پانی اس میں چلا جاتا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ سانس اپنے سینے میں روک لیا۔ دس سیکنڈ...... بیس سیکنڈ ...... تیس سیکنڈ...... چالیس پینتالیس سیکنڈ...... اس کے ننھے وجود میں آواز گونجنے لگی۔

''چاچا...... مجھے چھوڑ دے...... چاچا ہاتھ ہٹالے ...... میں مرجاؤں گا...... میرا دم گھٹ رہا ہے...... میرا سینہ پھٹنے والا ہے۔ چاچا...... مجھے پانی سے نکال لے...... میں مر رہا ہوں...... میں مر رہا ہوں......'' ایک جھٹکے کے ساتھ وہ ہوش میں آ گیا...... چوڈیرو حویلی کے ''غنڈوں'' کی بدترین مار کھانے والا دلاور ہوش میں آ گیا...... گہرے پانی کی مچھلی ...... گہرے پانیوں کا شناور...... سرفودم گھٹ کا ''لے پالک'' ہوش میں آ گیا۔

اس کے جسم کا ایک ایک حصہ اذیت کے سپرد تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ پانی حلق کے راستے اس کے جسم میں چلا گیا تھا۔ صورتِ حال خطرناک تھی۔ اس کے پھیپھڑوں کو ہوا درکار تھی...... جو پانی کی اس تہ میں ناپید تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سطح آب پر آنا چاہا مگر اس کے کرم فرماؤں نے ایک نیکی یہ بھی کی تھی کہ اس کی کمر کے ساتھ ایک رسا باندھا گیا تھا۔ رسّے کا دوسرا سرا کسی گاڑی یا ٹریکٹر کے آہنی ایکسل کے ساتھ منسلک تھا۔ دلاور نے تیر کر اوپر آنا چاہا مگر وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلانے کے باوجود ایک فٹ بھی اوپر نہ جا سکا۔ بڑے اہم اور کٹھن لمحے تھے۔ دلاور نے رسے کو پکڑ کر کھینچا اور ایکسل تک پہنچ گیا۔ اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے ایکسل کو اٹھایا۔ ایک ڈیڑھ فٹ اوپر لایا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ایکسل کو چھوڑ دیا۔ اب وہ کمر کے گرد بندھے رسّے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے رسے کو پکڑ کر زور زور سے کھینچا...... شاید رسّا ایکسل سے جدا ہو جائے...... مگر قسمت کی دیوی مہربان نہیں ہوئی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا اور رسّے کو جھٹکے دینے لگا......

''چاچا...... چاچا...... مجھے باہر نکال لے...... میں مر رہا ہوں...... میرا سینہ پھٹنے والا ہے چاچا...... بس کر چاچا! میں مرجاؤں گا...... مجھے پانی سے نکال لے......''

اس نے تصور میں دیکھا، اس کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ اس پر ایک خوشبودار چادر تھی۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور بہت سے لوگ کندھوں پر اس چارپائی کو اٹھائے بھاگے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا سب کو بہت جلدی ہے۔ ہر طرف سر ہی سر ہیں اور لوگ دیوانہ وار بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اس کا جنازہ تھا۔ یکایک منظر غائب ہو گیا۔ مہلت مل گئی۔ رسّے کی گرہ تو نہیں کھلی مگر وہ ایکسل سے جدا ہو گیا۔ پانیوں کا بادشاہ ...... پانی کو پچھاڑتے ہوئے سطح آب پر آ گیا...... وہ کنارے پر رینگتا ہوا خشکی پر آ گیا...... یہ کوئی بیلا تھا ...... ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ اس کے ڈوبتے ذہن نے ایک فائر کی آواز سنی پھر اس کا ذہن اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوبارہ اس کی حسیات بیدار ہوئیں تو اس نے کچھ لوگوں کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''لگتا ہے...... اب بچ جائے گا یہ......''

''اسے اسپتال لے جاتے ہیں......''

''مگر یہ پولیس کیس ہے۔ کہیں......؟''

''اوئے دیکھ لیں گے ...... کیس ...... کو بھی ...... پولیس کو بھی...... پتا نہیں کس مائی کا لال ہے...... ڈالو اسے جیپ میں، ابھی اسپتال لے کر چلتے ہیں۔''

پھر دلاور نے خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا۔ جب کبھی کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ بھاری دھند کے پار سے کوئی روشنی کی کرن نمودار ہوتی تو دلاور کو اس میں کچھ مناظر نظر آتے ...... ڈاکٹر اس پر جھکے ہوتے ...... نرس گلوکوز کی بوتل میں سرنج کے ذریعے کوئی پیلا سا محلول انجیکٹ کر رہی ہوتی۔ کبھی کچھ اجنبی سے لوگ اسے اپنے اردگرد منڈلاتے نظر آتے۔

یہ دھوپ چھاؤں پتا نہیں کتنے دن چلتی رہی۔ جب باقاعدہ اس نے آنکھ کھولی تو خود کو ایک درمیانے درجے کے کمرے میں پایا۔ اس نے پردہ سرکا کر دیکھا تو دن کی روشنی میں اسے کپاس کا ایک بلند پہاڑ نظر آیا۔ کچھ بندے سیدھے بیلچوں کی مدد سے کپاس کو اکٹھا کر رہے تھے۔ وہاں کچھ عورتیں بھی تھیں جنھوں نے موٹے دبیز کپڑوں کے جھولا نما بڑے بڑے فراک پہن رکھے تھے۔ ان میلی کچیلی عورتوں نے بڑی بڑی بالیاں پہن رکھی تھیں اور ناک کی درمیانی جھلی میں دو، دو...... تین، تین چھوٹی بالیاں پرو رکھی تھیں۔ کچھ ننگ دھڑنگ بچے اودھم مچا رہے تھے...... پتا نہیں کیوں...... اس کو یہ منظر بھلا لگا...... شاید...... یہ زندگی تھی......

اور وہ...... اس "چارپائی" سے اتر کر آ رہا تھا جس کو بہت سے لوگ بڑی تیزی سے بھگائے لے جا رہے تھے۔

دلاور اپنے حواس میں آیا...... سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں...... تو گزرے ہوئے واقعات کی فلم پوری جزئیات کے ساتھ اس کے دماغ میں چل گئی۔ اس کو غم سے نڈھال ہو جانا چاہیے تھا۔ درد سے بے حال ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کے من میں ٹھہراؤ ڈیرے ڈال چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس چارپائی سے نیچے اتر کر آ رہا تھا جسے لوگ بھگائے لے جا رہے تھے۔ شاید اس نے دوسرا جنم لیا تھا۔

دلاور کو اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی جان بچانے والے لوگ حضور چانڈیو کے کارندے تھے، جو صبح ہونے سے پہلے مرغابیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ شکار کے دوران میں ان کی نظر نیم مردہ دلاور پر پڑی اور وہ اسے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ دلاور سات آٹھ دن اسپتال میں رہا تھا۔ اسپتال میں ہی حضور چانڈیو کے ایک کارندے نے دلاور کو پہچان لیا۔ جب حضور چانڈیو تک خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دلاور کو سبز حویلی لایا جائے۔

سبز حویلی میں یہ اس کا دوسرا دن تھا۔ دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ یہی وہ حضور چانڈیو ہے جس کے ساتھ شاہ زمان اور شاہ فرمان کی خونی دشمنی چل رہی تھی۔ دونوں پارٹیوں کے کئی بندے قتل ہو چکے تھے اور ایک دوسرے پر درجنوں کیس بنے ہوئے تھے۔ پہلے حضور چانڈیو کے "کارِ خاص" افضل بھگا نے دلاور سے سوال جواب کیے پھر حضور چانڈیو خود دلاور کی کتھا سننے کے لیے آن موجود ہوا۔ حضور چانڈیو قدرے سانولے رنگ اور اونچی ناک والا ایک درمیانی عمر کا چودھری تھا۔ وہی وڈیروں والی تن فن اور اونچے شملے والی پگڑی...... بہر حال فی الوقت وہ دلاور کا محسن اور میزبان تھا۔

دلاور نے اپنی کہانی کے کچھ حصے چھوڑ کر باقی سب کچھ چانڈیو کے گوش گزار کر دیا۔ دلاور نے اسے بتایا کہ اس پر کتنا گھناؤنا الزام لگا کر اور کس طرح جاں بلب کر کے چوڈیرو حویلی والوں نے اسے پانی کی نذر کر دیا تھا۔

حضور چانڈیو نے کہا۔ "سو حرامزادوں کو اکٹھا کیا جائے تو ان کا ایک حرامزادہ یہ شاہ فرمان بنتا ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے، اس نے چھوٹے بھرا کی موت کے بعد اس کی زنانی (سویرا) پر بھی اپنی گندی نظر رکھی ہوئی ہوگی۔ تم دیکھ لینا، وہ بہت جلد پانچویں شادی بھی کھڑکا دے گا۔"

ان باتوں کے دوران میں ہی چانڈیو کی ایک ملازمہ ٹرے میں دودھ کی سردائی کا ایک بڑا جگ اور ایک گلاس رکھ کر لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ حضور چانڈیو کا "سردائی ٹائم" ہے۔ ملازمہ کا نام بعد از اں سندری معلوم ہوا۔ وہ کالے رنگ کی تھی لیکن بہت تیکھے نقوش اور تیز طرار۔ وہ انہی عورتوں کے قبیلے سے لگتی تھی جن کو دلاور نے کپاس کے بلند ڈھیر کے پاس دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ میلی کچیلی تھیں مگر یہ خوب نکھری پتھری ہوئی تھی۔ جیسے سیاہ بوٹوں کو پالش کر دیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں۔ وہ بھی سر پر تیل چوپڑے، کس کے بال باندھے، آنکھوں میں کاجل لگائے ایسے ہی دمک رہی تھی۔

پچھلے چند ہفتوں میں دلاور کو بہت اچھی طبی امداد ملی تھی۔ ورنہ جس بے دردی سے اسے مارا گیا تھا، شاید وہ کئی ماہ تک بستر سے نہ اٹھ سکتا۔ اس کے جسم کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مسل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ کم از کم دو جگہ ہڈیوں میں ہیئر لائن فریکچر تھے۔ بے شمار اندرونی اور بیرونی چوٹیں تھیں۔

جب وہ اکیلے میں ان مناظر کو یاد کرتا تو اس کے سینے کے اندر جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرنے لگتا۔ اسے وہ قیامت کے لمحے یاد آتے جب شاہ فرمان کے چہیتے ٹیپو ٹریگر نے دیگر کارندوں کے ساتھ مل کر اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ دلاور کے لیے سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ سویرا کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اس ہستی کی موجودگی میں جس کے لیے وہ اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ جس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔

آہ...... وہ یہ سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کیا دلاور کے دل سے کوئی راہ سویرا کے دل تک نہ جاتی تھی؟ اگر جاتی تھی تو پھر اس کی آنکھوں میں نمی کیوں نہیں آئی تھی؟ اس کے قدم اسے چھڑانے کے لیے کیوں نہیں اٹھے تھے؟ کیوں وہ پتھر کا بت بنی کھڑی رہی تھی؟

وہ جب یہ سب کچھ سوچتا تھا تو دل ہی دل میں کراہ اٹھتا تھا...... سویرا! کیا تم نے بھی وہی سمجھا جو دنیا والوں نے سمجھا...... کیا ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا...... کیا دل سے دل تک جانے والی کوئی راہ نہیں تھی؟ یہ بات روزِ روشن کی طرح بالکل عیاں تھی کہ اس کے خلاف گھناؤنی سازش ہوئی تھی۔ اسے پھنسایا گیا تھا۔ اسے پھنسانے کے لیے جوڑ ا مار ا جایا گیا، اس کا ڈائریکٹر یقیناً شاہ فرمان تھا اور ٹیپو ٹریگر نے اہم ترین رول ادا کیا تھا...... ایک دن وہ بستر پر لیٹا اسی طرح

اپنے خیالوں میں گم تھا کہ چونک گیا۔ کھڑکی میں سے سبز حویلی کے سرسبز لان میں اسے دور کچھ درختوں کے نیچے حضور چانڈیو نظر آیا۔ وہی چودھریوں جیسا بڑا پگڑ اور کلف دار کڑکتی ہوئی شلوار قمیص ...... حضور چانڈیو کے ساتھ ایک بارعب عربی شیخ تھا۔ اس نے اماراتی طرز کا لمبا لبادہ پہن رکھا تھا اور سر پر ڈبی دار رومال تھا۔ اردگرد مؤدب ملازمین تھے جن میں افضل بھگا بھی شامل تھا۔ شیخ کے ہاتھ پر دستانہ تھا اور دستانے پر وہی بے مثال باز پھڑپھڑا رہا تھا جسے ایک دن کچا قلعہ کی اونچی دیواروں سے نکالنے کے لیے ولاور نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ باز کے سر پر مخملی اندھیاری یعنی غلاف تھا۔ موقع پر موجود ہر شخص بے حد اشتیاق سے اس نایاب پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ سارے لوگ درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

ولاور نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شیخ تھا جس نے اس پرندے کے حصول کے زندگی موت کا مسئلہ بنا رکھا تھا اور جس کے لیے ضد میں آ کر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے ادا کیے گئے ہیں۔ یہ شیخ ابھی تک اس سبز حویلی میں موجود تھا۔ یا شاید دوبارہ یہاں آیا تھا۔

شام کو جب افضل بھگا سے ولاور کی ملاقات ہوئی تو اس سے اس بارے میں بات ہوئی۔ شیخ صاحب کا نام بن باقر معلوم ہوا۔ افضل بھگا نے بتایا۔ ”یہ لوگ اب واپس دبئی جا رہے ہیں۔ کافی سیر سپاٹے کر لیے ہیں انہوں نے۔“

”یہ لوگ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا شیخ صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”ہاں ان کی سب سے چھوٹی بیگم دو ملازم بھی ہیں۔ چھوٹی بیگم بہت زیادہ لاڈلی ہے۔ شیخ صاحب اس کی ہر بات مانتا ہے۔ وہ پاکستان دیکھنا چاہتی تھی، خاص طور سے وہ علاقے جہاں شکار وغیرہ ہوتا ہے، اس کی فرمائش پوری ہوئی لیکن اس کی کوئی ایک فرمائش تھوڑی ہے۔ ہر روز نئی فرمائش ہوتی ہے۔ کبھی کسی میلے میں جاتی ہے، کبھی پہلوانوں کی کشتیاں دیکھتی ہے۔ کبھی کسی کچی بستی میں جا کر رات گزارنا چاہتی ہے۔ اب اس کی ایک تازہ فرمائش ہے جسے سن کر شاید تمہیں بھی حیرانی ہو۔“

”وہ کیا؟“

”پانی کے جہاز کے ذریعے واپس دبئی جانا چاہ رہی ہے۔ اب شیخ کے بندے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں کہ سمندری سفر کا بندوبست کیا جائے ......“

افضل اور ولاور میں یہ گفتگو سبز حویلی کے پچھلے احاطے میں ہو رہی تھی۔ دونوں گھاس پر آلتی پالتی مارے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اچانک افضل کے چہرے کا رنگ بدلا، وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ”لو بھئی ...... بڑی لمبی عمر ہے شیخ صاحب کی ...... وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔“

وہ دونوں جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر چند ملازموں کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔ حضور چانڈیو نے ولاور کی طرف اشارہ کر کے بن باقر سے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ بن باقر کے ملازم نے بن باقر تک پہنچایا۔ بن باقر کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوئی، حضور چانڈیو نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ ”اوئے ولاور! ادھر آ ......“

ولاور اور افضل بھگا، حضور چانڈیو کے پاس پہنچے۔ دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ شیخ کی نگاہیں بدستور ولاور کا طواف کر رہی تھیں۔ حضور چانڈیو نے کہا۔ ”ولاور ے، شیخ صاحب تیری سخت جانی کا سن کر بڑے حیران ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ شاہ زمان کے غنڈوں نے تجھے مردہ سمجھ کر ڈونگے چھپڑ میں پھینک دیا تھا اور تیرے پنڈے کے ساتھ کوئی دو من کا لوہے کا ایکسل باندھ دیا تھا مگر تو پھر بھی ہمت کر کے نکل آیا ......“

بن باقر نے عربی میں کچھ پوچھا۔ اردو دان ملازم نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب شیخ تم سے پوچھ رہے ہیں کہ ملازمت کرنا پسند کرو گے؟“

ولاور نے کہا۔ ”میں تو چانڈیو صاحب کا بے دام کا غلام ہوں۔ اگر وہ آگ میں چھلانگ لگانے کا کہیں گے تو ابھی لگا دوں گا۔“

ولاور کا جواب شیخ تک پہنچا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ ولاور کے سراپا کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گھوڑا، اونٹ یا باز وغیرہ خریدنے سے پہلے اسے دیکھا جاتا ہے۔ ولاور کو یہ انداز اچھا تو نہیں لگا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھا کرتا تھا۔

شیخ نے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے ولاور سے کہا۔ ”شیخ صاحب فرماتے ہیں، وہ تمہیں ساتھ لے جانے کے بارے میں سوچیں گے ......“

افضل بھگا اور ولاور نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا ...... وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس دن شیخ بن باقر تلور کا شکار کھیلنے کے لیے پوری پلٹن کے ساتھ رحیم یار خان سے کچھ آگے مالن پور کے بیلے میں موجود تھا۔ چھوٹی بیگم بھی ساتھ تھی۔ بن باقر چالیس سے

پینتالیس کے پیٹے میں تھا جبکہ چھوٹی بیگم بمشکل بائیس تیئس سال کی تھی۔ اس کی ایک فرمائش ابھی پوری نہیں ہونے پاتی تھی کہ دوسری کا تقاضا شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس نے ایک مقامی میلے میں جانے کی فرمائش کر دی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ بن باقر کا قافلہ، اندرونِ شہر سے گزر رہا تھا۔ وہاں ایک کھلی جگہ پر میلے کا اہتمام تھا۔ روایتی پنگوڑے...... مقامی کھانے ...... انوکھے کھیل تماشے...... چھوٹی بیگم نے انگلی سے میلے کی جانب اشارہ کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ بن باقر کے حکم سے قافلے کا رخ میلے کی طرف ہو گیا۔

پاکستان سے روانگی میں تین دن باقی تھے اور آج چھوٹی بیگم کی شکار دیکھنے کی خواہش سب کو مالن پور لے آئی تھی۔ دلاور اور افضل بھگا بھی شکار پارٹی میں شامل تھے۔ شکار تین چار گھنٹے تک جاری رہا۔ پندرہ بیس پرندے تو صرف شاہن باز کے ذریعے شکار ہوئے۔ دلاور سارا دن غم کی تصویر بنا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج اتنے دنوں بعد اس کے دل کے موسم میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ سویرا بے طرح اسے یاد آ رہی تھی۔ ہاں وہی سویرا جس نے اسے عشق کی ایک ایسی سولی پر چڑھا دیا تھا، جو مارتی نہیں تھی بس جاں کنی کے عالم میں رکھتی تھی۔ وہی سویرا جس کی موجودگی میں اس پر تشدد کی انتہا کر دی گئی تھی۔ جس حویلی سے وہ مرتے دم تک نہیں نکلنا چاہتا تھا وہاں سے اسے نکال باہر کیا گیا تھا۔ روہی کے اجنبی سناٹے اس سے جدا ہو گئے تھے۔ پستہ قد بیریوں سے وہ بہت دور چلا آیا تھا اور اس ہوا سے بھی جس میں اس کا بے رحم محبوب سانس لیتا تھا...... شاید کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لمبے پنڈے اوکھیاں راہواں عشق دیاں......

اگلی رات حضور چانڈیو نے اسے نشست گاہ میں طلب کر لیا۔ دلاور نشست گاہ میں پہنچا تب بھی بے حد دل گرفتہ تھا۔ حضور چانڈیو نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''نہیں حضور سائیں!'' دلاور نے آہستگی سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔

''میں کہوں گا کہ تم بن باقر کے ساتھ دبئی چلے جاؤ......''

دلاور کچھ دیر سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''حضور سائیں! میں چوڑیرو حویلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں ...... اپنے اوپر لگے ہوئے جھوٹے الزام کو مٹانا چاہتا ہوں۔''

حضور چانڈیو بڑی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اپنے سگریٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''شاہ فرمان بہت کمینہ آدمی ہے۔ جہاں تمہاری سوچ ختم ہوتی ہے، اس کی کمینگی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیپو ٹریگر اس کا خطرناک پتہ ہے۔ چوڑیرو حویلی جاؤ گے تو اس بار وہ تمہاری آخری سانس تک نکال لیں گے۔ میرا کہا مانو تو ابھی ادھر ادھر ہو جاؤ۔ اگر ان کنجروں کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم زندہ ہو...... تو وہ بھوکے بگیاڑوں کی طرح تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے اور تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس ویلے ان کا زور چل رہا ہے۔''

جواب میں دلاور خاموش رہا۔ حضور چانڈیو نے بات جاری رکھی۔ ''شیخ باقر بہت چنگا آدمی ہے۔ اس کی ملازمت کر کے بڑے فائدے میں رہو گے تم۔ تمہارے علاوہ سندری اور شاید دو لڑکے اور بھی جائیں گے۔ بس عام سا چھوٹا موٹا گھر کا کام ہوگا......''

دلاور کی نگاہوں میں یکایک وہ تمام مناظر روشن ہو گئے جب اسے بدترین مارپیٹ کا نشانہ بنا کر پانی میں پھینک دیا گیا تھا۔ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ یہ بھی ایسا ہی لمحہ تھا۔ دلاور کے ذہن نے مختصر وقت میں سارے حساب کتاب جوڑے اور وہ تین دن بعد پاکستان چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہاں ...... وہ اس زمین ...... اس دھرتی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا جہاں اس کا سنگ دل محبوب رہتا تھا اور جہاں اس نے اپنی زندگی کے اَن گنت سال گزارے تھے۔ وہ ایسی غربت کی ماری، لاچار زندگی جینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر کچھ بدل چکا تھا۔

☆☆☆

جدید طرز کا تفریحی بحری جہاز کھلے سمندر میں دبئی کی طرف رواں تھا۔ گلف ڈریم نامی یہ جہاز درمیانے سائز کا تھا۔ اس میں قریباً 60 کمرے تھے اور ڈیڑھ سو مسافروں کے سفر کی گنجائش تھی۔ ان کا یہ سفر قریباً پانچ روز کا تھا۔ دلاور کو معلوم ہوا تھا کہ ویسے تو کراچی سے دبئی تک کا سمندری راستہ 1200 کلومیٹر سے کچھ کم ہی تھا اور یہ سفر ایک ڈیڑھ روز میں طے ہو سکتا تھا لیکن اس جہاز کو بہت ایزی اسپیڈ پر کھلے سمندر کی سیاحت کرتے اور کچھ جگہوں پر رکتے ہوئے جانا تھا۔ بن باقر پاکستان سے جن چار ملازموں کو ساتھ لے کر جا رہا تھا، ان میں دلاور کے علاوہ سندری، اس کی ماں اور ایک مکرانی لڑکا تھا۔ گلف ڈریم نے پاکستانی حدود کو چھوڑا تو دلاور کی آنکھوں میں نمی لہرا گئی۔ دور ...... روہی کی ریتیلی زمین پر کھڑی پستہ قد بیریوں کے آس پاس آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کچھ سرگوشیاں تھیں ...... تم کب تک مجھ کو

بھولو گے...... صحرا کی جھلسی دوپہروں میں کچھ اَن دیکھی سی راہیں ہیں......

یہ سفر کے دوسرے روز کی بات ہے۔ دلاور رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔ کمرانی لڑکا دلاور کے ساتھ والے بیڈ پر چھوٹے کیبن میں سو رہا تھا۔ لگژری جہاز بحیرۂ عرب کے سینے کو چیرتا ہوا منزل کی طرف گامزن تھا۔ رات آخری پہر دلاور کی آنکھ لگ گئی مگر پھر اچانک کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی وہ تھوڑی دیر سویا ہے۔ باہر دن کا خوبصورت اجالا پھیل چکا تھا۔ کچھ بلند آوازیں باہر سے سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی تیز عربی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ دلاور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ بڑی شاندار دھوپ تھی، اور گہرا نیلا آسمان۔ شیخ بن باقر اپنے ایک عربی ملازم سے سخت لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک جدید پنجرے میں وہ شان دار نایاب باز ٹہل رہا تھا جس کے لیے کروڑوں روپے ادا کیے گئے تھے۔ باز کی چونچ خون سے سرخ نظر آ رہی تھی۔ عرشے کے فرش پر بلی کا ایک معصوم سا بلونگڑا شدید زخمی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں۔

معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باز کو پنجرے سے نکالا گیا تھا۔ بن باقر کے عربی ملازم نے غلطی سے باز کی اندھیاری (آنکھوں کو ڈھانپنے والی تھیلی) اس کے سر سے ہٹادی۔ یہ بدقسمت بلونگڑا قریب ہی موجود تھا۔ باز اپنی تربیت کے مطابق اس پر جھپٹ پڑا اور چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اب اس کی ماں حسرت کی تصویر بنی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

دلاور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے لگا کہ ان چودھریوں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی اکثریت، شکاری باز جیسی فطرت ہی رکھتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی کمزور پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ معاشرہ اور قانون وغیرہ بس چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اسی اثنا میں دلاور کی نظر حضور چانڈیو پر پڑی اور اسے پہلی بار یہ پتا چلا کہ وہ بھی اس جہاز میں موجود ہے۔ دلاور نے حضور چانڈیو کو دیکھ کر حیرانی ظاہر کی۔ وہ ایک آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو بس سیر سپاٹے کے لیے جا رہا ہوں دلاور...... دس پندرہ دن رہ کر ہوائی جہاز سے واپس آ جاؤں گا اور اگر تیرا دل نہ لگا تو بے شک تو بھی آ جانا۔ پر میری صلاح تو یہی ہے کہ تو سال دو سال کے لیے وہاں ٹک جا۔“

شاید حضور چانڈیو کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں شیخ باقر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں آ گیا۔ چوکس ملازموں نے مستعدی سے دو تین مزید لگژری کرسیاں وہاں رکھ دیں۔ شیخ باقر کے ساتھ اس کے دو کویتی دوست بھی تھے۔

حضور چانڈیو نے مترجم کے ذریعے دلاور کا تعارف کرایا۔ آخر میں بولا۔ ”جناب عالی! جنات جیسا کام کیا ہے اس نے۔ ان ظالم دشمنوں نے کوئی تین من لوہا باندھا تھا اس کے پنڈے کے ساتھ...... اور یہ سخت زخمی بھی تھا۔ پر نکل آیا زندہ سلامت۔ پہاڑ جیسی ہمت ہے جی اس کی۔“

شیخوں کی دلچسپی اس میں بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے مؤدب کھڑا رہا۔ اس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انسان نہیں خچر، گھوڑا یا کوئی اعلیٰ نسل کا پالتو جانور ہے اور حضور چانڈیو دوسروں کے سامنے اس کی ملکیت پر فخر محسوس کر رہا ہے۔ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے...... دیکھو یہ میرا ہے، میرا مطیع ہے، میرا محکوم ہے، میرا پالتو ہے، دیکھو ذرا میری پسند کو۔

مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھتا تھا...... اور بڑی آپا بھی...... اور شاہ فرمان بھی...... اور شاید...... شاید نہیں...... وہ ایسی نہیں تھی، وہ نہیں تھی ایسی...... لیکن اگر وہ ایسی نہیں تھی تو پھر......

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو جاتا تھا...... یہ سمندری سفر کی تیسری رات تھی۔ گلف ڈریم تاریکیوں کو چیرتا ہوا منزل کی طرف رواں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد حضور چانڈیو کو بدن دبوانے کی عادت تھی بکرانی لڑکے کو بخار تھا اور الٹیاں آ رہی تھیں۔ مٹھی چاپی کی ذمے داری دلاور پر آ گئی۔ حضور چانڈیو کے لگژری روم میں وہ ایک گھنٹا اس کی مٹھی چاپی کرنے اور اس کی زبانی شاہ فرمان کی شان میں ”قصیدے“ سننے کے بعد وہ اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا جب اس نے سندری کو دیکھا۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ اس لگژری اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جہاں بن باقر کا کویتی دوست مقیم تھا۔ دلاور احتیاط سے پیچھے گیا اور ایک منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نہائی ہوئی اور قدرے بنی سنوری سندری بڑی خاموشی کے ساتھ کویتی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ بے شک وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے لیکن بہت ڈری سہمی ہوئی ہے۔

پتا نہیں کیوں باز اور معصوم بلونگڑے والا سین پھر دلاور کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہاں، باز طاقتور تھا اور بلونگڑا کمزور۔ اسے باز کے پنجوں میں آنا ہی آنا تھا۔ سندری کالی سیاہ تھی لیکن تر و تازہ اور چمکدار تو تھی...... اور کالا انگور بھی تو

ہوتا ہے۔ پھلوں کے شوقین ہر طرح کا پھل چکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دلاور ایک طویل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

صبح وہ ایک نامانوس سا شور سن کر جاگا تھا۔ وہ کیبن سے باہر نکلا اور چند زینے طے کر کے عرشے پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ بن باقر کی نوجوان چلبلی بیوی ایک طرف کرسی پر بیٹھی بھوں بھوں رو رہی تھی اور بن باقر اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی دو بندے غوطہ خوری کے لباس میں کھڑے تھے۔

بیوی کو چپ کرانے کی ناکام کوشش کے بعد بن باقر غوطہ خور ملازموں پر برس پڑا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ ''لگژری شپ ہے یہ...... اور اس میں انتظامات کیا ہیں تم لوگوں کے۔ آکسیجن سلنڈر تک کام نہیں کر رہا تم لوگوں کا۔ ہزاروں ڈالرز سیکیورٹی کے کھاتے میں لیتے ہو تم لوگ...... کیا ہے تمہاری مینجمنٹ؟''

''سوری سر! ہم نے کوشش تو پوری کی ہے۔'' ایک ''سی ڈائیو'' بولا۔

''کوشش کو میں نے چاٹنا ہے۔ مجھے میری چیز چاہیے۔ کہاں ہے تمہارا کیپٹن...... کس کی گود میں گھس کر سویا ہوا ہے۔ اسے بلاؤ۔''

اس مکالمے سے جو کچھ دلاور کی سمجھ میں آیا اور جو کچھ اسے اردگرد موجود لوگوں سے معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ بن باقر کی چلبلی بیوی عروسہ چڑھتے سورج کی نرم روشنی میں اپنی سیلفیاں لینے کے لیے عرشے پر آ گئی۔ اس کے پاس قیمتی جیولری سے بھرا ہوا ایک ہینڈ باکس بھی تھا۔ وہ ایک ایک زیور اس میں سے نکال کر پہنتی۔ اپنی سیلفیاں لیتی اور اسے دوبارہ باکس میں رکھ دیتی۔ وہ اس خود ستائشی میں اتنی مگن ہوئی کہ عرشے کے بالکل کنارے پر چلی گئی۔ باکس اس کے قریب ہی فرش پر رکھا تھا۔ ایک چوکس ملازم بھی قریب ہی کھڑا تھا مگر دونوں چوک گئے۔ جڑاؤ زمرد والا ایک نیکلس پہن کر جب عروسہ سیلفی لے رہی تھی، اس کے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر جیولری باکس کو لگی اور وہ چکنی سطح پر پھسل کر تیس فٹ نیچے سمندر میں جا گرا...... جہاز کو وہیں روک لیا گیا تھا۔ اسے تھوڑا سا ریورس چلا کر موقع واردات پر لایا گیا تھا۔ اب پچھلے قریباً ایک گھنٹے سے جہاز کی سیکیورٹی کے غوطہ خور قریباً تیس میٹر تک نیچے جا کر باکس کو تلاش کرتے رہے تھے۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اب مزید تلاش اس لیے روک دی گئی تھی کہ ''سی ڈائیونگ'' میں استعمال ہونے والے ایک سلنڈر کے میکنزم میں خرابی واقع ہو گئی تھی اور دوسرے کا ماؤتھ پیس کسی نکیلے پتھر سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔

...... اسی دوران میں کیپٹن کا معاون ''کیپٹن'' کو بلا کر عرشے پر لے آیا۔ نشے کی وجہ سے کیپٹن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بمشکل ہی اٹھ پایا تھا۔ بن باقر، کیپٹن پر بھی برسنا شروع ہو گیا۔ وہ اسے ناقص انتظامات کے طعنے دے رہا تھا اور دیر سے یہاں آنے پر بھی لتاڑ رہا تھا۔ کیپٹن پہلے تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے بھی چند سخت جملے کہے۔ وہ بولا۔ ''میڈم کو اس خطرناک انداز میں سیلفیاں لینے کے لیے کس نے کہا تھا۔ اگر جیولری کی جگہ خدانخواستہ ان کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ اس طرح کی سیلفیاں بہت سے لوگوں کی جان لے چکی ہیں۔''

جہاز رکا ہوا تھا۔ ہنگامہ جاری تھا۔ شیخ کی دو ملازمائیں روتی دھوتی عروسہ کو اس کے کمرے میں لے گئیں۔ پتا چلا کہ باکس میں عروسہ کی تقریباً تمام جیولری موجود تھی۔ اس میں ہیروں کے سیٹ اور ''اینٹیک پیس'' بھی تھے۔ کچھ نہایت بیش قیمت خاندانی گہنے اس کے علاوہ تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی ان اشیا کی قیمت اسّی نوّے کروڑ کے قریب تھی۔ حضور چانڈیو اور شیخ کے کویتی دوست بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ جہاز کا ترک کیپٹن...... وائرلیس کے ذریعے کسی اردگرد کے جہاز یا لانچ وغیرہ سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ غوطہ خوروں کا انتظام کیا جا سکے۔ مایوس کن اطلاع یہ تھی کہ علاقے میں طوفان کی آمد تھی اور قرب و جوار میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی مدد کو پہنچ سکتا۔ اچانک حضور چانڈیو کی نظر دلاور پر پڑی اور دلاور نے حضور چانڈیو کی نگاہ میں ایک تیز چمک نمودار ہوتے دیکھی۔ وہ کچھ دیر تک دلاور کو دیکھتا رہا پھر سیدھا اس کی طرف آیا۔ ''دلاورے! یہ نئے فیشن کے غوطہ خور تو بکری بن گئے ہیں پر...... مجھے لگتا ہے کہ تو کوئی کام دکھا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی پنجابی ٹوبے کا پتر ہے تو۔ بڑی مشہوری ہے تیری اس بارے میں۔''

وہ ٹھٹک کر حضور چانڈیو کو دیکھنے لگا۔ ''نن...... نہیں چودھری جی! میں چھوٹے موٹے چھپڑوں، تالابوں میں تو چلا جاتا ہوں، پر یہ تو سمندر ہے۔''

''سمندر ہے، پر زیادہ ڈونگا تو نہیں ہے نا۔ وہ دیکھ اس پاسے ایک پتھر بھی نظر آ رہا ہے۔''

دلاور نے دیکھا جہاز سے کوئی آدھ کلومیٹر دور کسی

چٹان کا نوک دار سرا سمندر کے نیلے پانی میں سے نکلا ہوا تھا۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے کسی عقاب کی مڑی ہوئی چونچ ہو۔ اس سے پہلے کہ دلاور جواب میں کچھ کہتا، حضور چانڈیو لپکتا ہوا ابن باقر کی طرف چلا گیا اور مترجم کے ذریعے بن باقر کے ساتھ جوشیلے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بڑے فخریہ انداز میں دلاور کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تیزی سے دلاور کی طرف آیا، اس کا کندھا تھپک کر جوش سے بولا۔ ''ان کو یقین نہیں آ رہا کہ تو سلنڈر شلنڈر کے بغیر پانی میں لمبی ڈبکی لگا سکتا ہے۔ پر مجھے پتا ہے تو لگا سکتا ہے۔ تو کر سکتا ہے۔''

''مم...... مگر چودھری جی......''

''اوئے اگر مگر کیا...... اب مجھے شرمندہ کرے گا؟ یہ بڑا زبردست موقع ہے اپنا آپ منوانے کا۔ اگر سچ مچ وہ ڈبا مل گیا تو شیخ کی اکھیوں کا تارا بن جائے گا تو۔ لمبا انعام شام بھی ملے گا۔''

دلاور سوچ میں تھا، حضور چانڈیو نے پھر اس کا شانہ تھپکا۔ ''اوئے سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ پنجابی شیر ہے تو۔ اٹھ دوڑ اور دکھا دے اپنی چھاتی کا زور۔''

...... قریباً پندرہ منٹ بعد سر فودم گھٹ کا تربیت یافتہ دلاور نیلے پانی میں اترنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی کمر سے ایک لمبا رسّا باندھ دیا گیا تھا اور وہ کنارے پر اپنے ننگے پاؤں جمائے کھڑا تھا۔ پانی میں کام کرنے والی ایک ٹارچ اس نے بیلٹ کے ذریعے اپنے پیٹ سے باندھ لی تھی۔ درجنوں پُرتجسس نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں جن میں حضور چانڈیو کی نگاہ بھی تھی۔ اس کی نگاہ میں ایک امید بھری فخریہ چمک تھی۔ دلاور نے اپنی سانس باہر نکالی۔ پانی میں جست لگائی اور نیچے اترتا چلا گیا...... ہاں پانی کی مچھلی۔ ایک فطری پیراک...... جسے ایک خاندانی ٹوبے نے اپنی بے رحم تربیت سے کندن بنا ڈالا تھا۔ یہ کندن برسوں سے خاک میں رل رہا تھا...... لیکن آج اس کی زندگی میں ایک سنہری موقع آیا تھا۔

وہ پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھ کر اکثر سوچا کرتا تھا...... اللہ نے اسے کس لیے بنایا ہے۔ وہ کس مرض کی دوا ہے؟ نہ ڈھنگ سے پڑھ سکا، نہ کوئی فن سیکھ سکا...... نہ کوئی ایسا ہاتھ تھامنے والا اسے ملا جو دنیا کی تیزی طراری اور آگے بڑھنے کے ہنر اسے سکھاتا۔ کیا اس کی قسمت میں معمولی کام اور چودھریوں کی چھوٹی موٹی ملازمتیں ہی لکھی ہیں؟ لیکن جب سے اس نے مرحوم شاہ زمان کے حکم پر کچے کی جھیل پار کی تھی اور سانپ نُما مل کے چنگل سے باز نکال کر چوڑیرو لایا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔

وہ سر کے بل سمندر کے پانی میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ مناظر دھندلا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اسے سمندری نباتات اور چھوٹے بڑے پتھر نظر آنے لگے۔ ان پتھروں میں مچھلیاں اور دیگر آبی حیات متحرک تھیں، یہ اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ بالآخر اس نے ٹارچ یعنی واٹر لائٹ روشن کر لی۔ اب اسے پانی کے اندر قریباً چار منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اس کے پھیپھڑوں نے ہوا کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مونگے کی چٹانوں اور کائی لگے پتھروں کے درمیان تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں دیوانہ وار اس باکس کو تلاش کر رہی تھیں جو گلابی رنگ کے فائبر کا بنا ہوا تھا اور جس کا ہینڈل چمکیلے پلاٹینم کا تھا۔ واٹر لائٹ کا دائرہ ہر طرف حرکت کر رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی اور بیلٹ میں اڑس لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسی سانس کے ساتھ پانی کی سطح تک پہنچ بھی سکتا ہے یا نہیں۔

...... اور وہ پہنچ گیا۔ بچھڑی ہوا، دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی۔ وہ بے طرح ہانپ رہا تھا۔ درجنوں سوالیہ نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر وہ لوگ جان گئے کہ کم از کم اس غوطے میں تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

حضور چانڈیو کی پکارتی ہوئی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہمت نہیں ہارنی شیرا! آج کچھ کر کے دکھا دو۔ میرا سر نیچا نہ ہونے دینا۔''

حوصلہ افزائی کی کچھ مزید آوازیں بھی اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ اوپر اسے عرشے پر عروسہ کی پریشان صورت بھی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر بھی امید و بیم کے سائے تھے۔ طوفان ابھی دور تھا لیکن سمندر میں ہلکی لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

تین چار منٹ تک سانس درست کرنے کے بعد دلاور نے اوپر عرشے پر ان تین تنومند ملازموں کو دیکھا جنہوں نے اس کی کمر سے بندھا ہوا رسّا تھام رکھا تھا۔ انہیں اشارہ کر کے دلاور پھر سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ زیادہ تیزی سے پانی میں اترا اور تہ میں پہنچ کر تلاش شروع کر دی۔ سانس الجھنے لگی تھی، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یکایک واٹر لائٹ کا روشن دائرہ پتھروں کے درمیان کسی چمکیلی چیز پر پڑا۔ دلاور کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی سے

پاس گیا...... رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ وہ گلابی باکس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ قریباً ڈیڑھ کیوبک فٹ کا باکس دو نکیلے پتھروں کے درمیان اٹکا ہوا تھا اور ایک آبی پودا اس کے اوپر ہلکورے لے رہا تھا۔ دلاور نے اس کے پلاٹینم کے ہینڈل کو ہاتھ لگایا تو کامیابی کی ترنگ جسم میں پھیل گئی۔ ابھی وہ سطحِ آب پر نہیں پہنچا تھا لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ عرشے پر کھڑے لوگوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے ہیں۔ وہ تالیاں بجا رہے ہیں اور نعرے بلند کررہے ہیں۔ حضور چانڈیو کی خوشی دیدنی ہے۔ وہ فخریہ انداز میں عربی اور دیگر مسافروں کی طرف دیکھ رہا ہے اور دلاور کی پیٹھ تھپکتا چلا جا رہا ہے۔

دلاور نے باکس پتھروں میں سے نکالا۔ اب اس کا اوپر کا سفر شروع ہوا چاہتا تھا لیکن اچانک ...... بالکل اچانک ...... اس کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ ہو گیا ہے۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ ایک فقرہ کسی آتشیں تیر کی طرح اس کے تصور میں لہرایا اور دماغ میں پیوست ہو گیا۔

یہ چوڈیرو حویلی کی بڑی آپا کی آواز تھی ...... ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں ......

یہ آواز نہیں تھی، پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کانوں کے راستے اس کے دماغ میں اترا اور اسے پتھرا گیا۔ سانس اس کے سینے میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ حرکت نہ کرسکا۔

...... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں، وہ برسوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرا دیتے ہیں۔ چند ساعتوں کے اندر اندر دلاور کے ذہن نے جیسے مدتوں کے نشیب و فراز دیکھ لیے۔ سارے بھوکے ننگے ایک جیسے نہیں ہوتے ...... لیکن اگر بقول بڑی آپا ہوتے ہیں، تو پھر اکثر سرمایہ دار بھی ایک جیسے ہوتے ہوں گے۔ حضور چانڈیو بے شک شاہ زمان اور شاہ فرمان کا دشمن تھا لیکن فطرت تو اس کی بھی ان جیسی ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی لشکارے تھے، اسے بھی اپنے اردگرد کیڑے مکوڑے ہی نظر آتے تھے۔ وہ بھی دلاور کی تعریفیں اسی انداز میں کرتا تھا جس انداز میں کبھی شاہ زمان کیا کرتا تھا۔ یہ میرا کارندہ ہے، یہ میرا پالتو ہے، بڑی اچھی نسل کا ہے...... ہاں یہ سب ایک جیسے ہی تھے۔ بڑی آپا ہو، شاہ فرمان ہو، حضور چانڈیو ہو، یا پھر شیخ بن باقر ہو اور عروسہ ہو...... ان سارے بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے ...... ایک جیسی ہوتی ہے...... آواز دلاور کے کانوں میں گونجتی چلی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ پانی میں پسینا نہیں آتا لیکن اسے لگا کہ اسے پسینا آ رہا ہے...... دیوانی سوچیں اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگیں...... اس نے شاہ فرمان اور شاہ زمان کی بے دام کی غلامی کی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی پروا بھی نہ کی۔ لاکھوں ریال کی مالیت کا ''باز'' اپنی جان پر کھیل کر واپس لایا...... اس کے صلے میں اسے کیا ملا؟ صرف ''کارِخاص'' کا خطاب...... اور جھوٹی تعریفیں ...... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی کایا کلپ ہوتے ہیں۔ وہ برسوں کا فاصلہ ساعتوں میں طے کرتے ہیں۔ دلاور نے یہ فاصلہ طے کرلیا...... اس نے بیش بہا جیولری باکس کو دوبارہ پتھروں کے درمیان پھنسا دیا۔ چوڑے پتوں والا آبی پودا اس کے اوپر کسی شیش ناگ کی طرح لہرانے لگا۔

دلاور کا سینا آکسیجن کی طلب میں پھٹ رہا تھا۔ اسے پانی میں اترے کم از کم دس منٹ ہو چکے تھے اور ابھی سطحِ آب تک پہنچنے میں اسے کم از کم تین منٹ مزید درکار تھے۔ کیا وہ تین چار منٹ تک سمندر کے قاتل پانی کو اپنے جسم میں داخل ہونے سے روک سکے گا؟ یہ بے حد سنگین سوال تھا...... بے حد مہلک ...... سرفو دم گھٹ نے کہا تھا...... پانی ڈوبے کو نہیں ڈبوتا، اس کی کم ہمتی ڈبوتی ہے...... پانی کے اندر اس وقت تک رہنا سیکھو جب تک تمہاری اکھیوں کے سامنے اندھیرے کی چادر نہ کھلنے لگے۔ جب اندھیرے کی چادر کھلنے لگے تو پھر اوپر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کردو......

......اور دلاور نے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کردیے۔ وہ اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے خوفناک غوطہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے خود کو دیوانہ وار حرکت دیتا چلا گیا۔ وہ اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا...... ہمت کر دلاور...... چند فٹ ...... صرف چند فٹ۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اسے روشنی نظر آ رہی تھی، یہ سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ پانی سے باہر لہرایا...... اور پھر ڈھیروں پانی اس کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ اندھیرے کی چادر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ جہاز کے عرشے پر ایک سائبان کے نیچے چت لیٹا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور سمندر میں اچھال تھا۔ دن میں ہی رات کا سماں بنا ہوا تھا۔ سب

مسافر اور عملے کے زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ جہاز درمیانی رفتار سے لہروں پر ہچکولے کھاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دلاور کے قریب مکرانی لڑکے رشید کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''اپن کو بڑی فکر لگی ہوئی تھی، شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔''

''کیا ہوا تھا؟'' دلاور نے پوچھا۔ (ویسے اسے ہر بات یاد آ چکی تھی)

''وڑی تمہارا ہاتھ تو نظر آ گیا تھا لیکن پھر تم ڈبکی کھا گیا، تم کو رستے سے اوپر کھینچ لیا گیا...... تمہارے پیٹ سے پانی نکالا گیا اور ڈاکٹر نے ایک ٹیکا بھی لگایا......'' مکرانی رشید اسے تفصیل بتانے لگا اور ساتھ ساتھ اس کے کندھے دبانے لگا۔

''چودھری جی کہاں ہیں؟'' دلاور نے پوچھا۔

رشید ذرا چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''وڑی کہاں ہونا ہے۔ اپنے کمرے میں ہوگا۔ تمہاری وجہ سے وہ کچھ شرمندہ بھی ہوا ہے۔ شیخ صاحب سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔ چلو چھوکرے نے کوشش تو کیا ہے۔''

''باقی کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہنا کیا تھا، بس منہ لٹک گئے تھے سب کے...... شیخ صاحب اور ترکی کیپٹن میں تھوڑا سا منہ ماری بھی ہوا۔ سمجھو کہ لفڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شیخ صاحب ابھی کچھ دیر اور وہاں رکنا چاہتا تھا مگر کیپٹن صاحب کا خیال تھا کہ سمندر میں ہلچل آ رہی ہے۔ اپن زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ یہ نہ ہو کہ جیولری ڈھونڈتے ڈھونڈتے جان کا لالہ پڑ جائے۔''

ان باتوں کے دوران میں سیاہ رنگت والی سندری بھی وہاں آ گئی۔ اسے بھی اس بات کا افسوس تھا کہ نیم بے ہوش دلاور کو یہاں عرشے پر چھوڑ کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ حضور چانڈیو بھی اپنے حال میں مست تھا اور کھا پی رہا تھا۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ دلاور اب کہاں ہے؟

سندری نے ہولے سے کہا۔ ''یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہووت ہیں۔ جب تک مطلب نا ہیں نکلتا بڑا کھیال رکھتے ہیں، مطلب نکل جاوے تو پھر میں کون تو کون؟''

دلاور نے سندری کی طرف دیکھا۔ اس کا چمکیلا پن کچھ ماند تھا۔ وہ مرجھائی مرجھائی سی نظر آتی تھی۔ شاید وہ ''ہڈ بیتی'' ہی بیان کر رہی تھی...... یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہووت ہیں......

''تھوڑی سی گرم چائے مل جائے گی؟'' دلاور نے مکرانی رشید سے پوچھا۔

رشید کے بجائے سندری نے جواب دیا۔ ''میں ابھی لے کر آوت ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپس مڑی لیکن پھر رک کر بولی۔ ''ویسے بھائی! تم نے کوشش تو پوری کی ہے۔ سب کو حیران کر دیا تھا اتنی دیر پانی میں رہ کر۔ وہ جو جہاز کا بڑا افسر ہے۔ اس کا تو ایک رنگ آوت تھا ایک جاوت تھا۔''

وہ چائے لینے چلی گئی۔ دلاور نے خود کو آرام کرسی پر ذرا نیم دراز کیا۔ رشید نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ یہ مکرانی رشید بڑا ہمدرد لڑکا تھا۔ سات آٹھ ماہ سے حضور چانڈیو کے ایک مچھلی فارم پر کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک شپنگ کمپنی کا پانڈی یعنی ''لوڈر'' تھا...... سیکڑوں دفعہ سمندر کے راستے دبئی جا چکا تھا۔ حضور چانڈیو نے مچھلی فارم ختم کر دیا تھا اس لیے وہ دوبارہ شپنگ کمپنی کی ملازمت کا ارادہ رکھتا تھا۔

سندری چائے لے آئی لیکن پتا نہیں کیوں دلاور کا چائے پینے کو دل نہیں چاہا۔ اسے سندری پر ترس آ رہا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے چاری غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہے۔ اسے لگا سندری کی ساری بے بسی، لاچاری اور ناپاکی اس چائے میں بھی در آئی ہے۔ اس نے سندری کا شکریہ ادا کر کے چائے ایک طرف رکھ دی۔

سندری چلی گئی۔ دلاور اسی طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ بارش ہلکی تھی لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ لہروں میں اچھال تھا۔ لہروں پر نگاہیں جمائے ہوئے دلاور نے رشید کو مخاطب کیا...... اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''رشید! جس جگہ ہم کو رکنا پڑا، وہ کون سی جگہ تھی؟''

''جہاں جیولری باکس گرا تھا؟'' رشید نے وضاحت چاہی۔ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ رشید بولا۔ ''وڑی اس کو ''برڈ سائٹ'' کہوت ہیں۔ شاید آپ نے دیکھا ہووے گا، ادھر دائیں طرف ایک اونچا پتھر پانی میں سے باہر نکلا ہوا ہے۔ کسی پرندے کی چونچ کے ماتق لگتا ہے۔''

''ہاں دیکھا تھا میں نے۔'' دلاور نے بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''یہ جگہ مسقط اور برکا سے پچیس تیس ناٹ شمال کی طرف ہے۔ ناٹ سمجھتا ہے نا آپ؟ یہ سمندری میل کو کہوت ہیں۔ پچھلے سال کی بات ہے۔ ایک دفعہ اپن ادھر سے گزر رہا تھا......''

مکرانی رشید اپنی روانی میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ کسی

پرانے سفر کی روداد سنا رہا تھا۔ رشید کی آواز دلاور کے کانوں تک پہنچ رہی تھی لیکن دماغ تک نہیں جا رہی تھی۔ اس کا دماغ تو کہیں اور تھا۔ کہیں دور نمکین اور تاریک سمندر کی گہرائی میں...... جہاں مونگے کی چٹانوں کے پیچھے، کالے اور خیالے رنگ کے پتھروں کے درمیان ...... کچھ موجود تھا۔ اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بارش برس رہی تھی اور گلف ڈریم لہروں پر ہلکورے لیتا منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وقت ہمیشہ آگے کی طرف رواں رہتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتی رہتی ہیں۔ رات اور دن ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ بہاریں اور خزائیں ایک دوسرے کے عقب سے نمودار ہوتی ہیں۔ چوڈیرو میں بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ کھیتوں کھلیانوں، کچے پکے...... گھروندوں اور دھول اڑاتے راستوں پر دھوپ اور چھاؤں کی بساط بچھی رہی...... اور اسی طرح چار برس گزر گئے......

چوڈیرو حویلی کی بلند دیواروں کے اندر جوتی ہوئی گردنوں والے لوگ بستے تھے۔ ان کی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ الگ رہن سہن، الگ رسمیں اور آسائشوں میں گھرے ہوئے الگ شب و روز لیکن اس حویلی میں ایک لڑکی دوسروں سے جدا تھی۔ وہ ہمیشہ سے جدا تھی لیکن پچھلے تین چار برسوں میں تو اور جدا ہو گئی تھی۔ اس کا نام سویرا تھا۔ جس سیاہ رات میں حویلی کے اندر طوفان بپا ہوا تھا، چنگھاڑیں گونجی تھیں، للکارے بلند ہوئے تھے، دلاور کو جانوروں کی طرح مارا گیا تھا اور پھر نیم مردہ کر کے ایک جیپ میں پھینک دیا گیا تھا...... اس سیاہ رات میں سویرا کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کرچی کرچی ہو کر اس کے جسم اور اس کی روح میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ایک خون سا رستا رہتا تھا۔ وہ سوچتی تھی...... اس رات وہ بھی مر کیوں نہ گئی...... کیوں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ لیکن...... لیکن وہ بالکل کھڑی تو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک بار بے ساختہ آگے بڑھی تھی لیکن بڑی آپا اور ایک ملازمہ نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ بالکل ہی پتھرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہی دیکھا تھا...... وہ جیپ میں اوندھا پڑا تھا، اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا تھا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ لوگ اسے لے گئے تھے۔ دفن کرنے کے لیے یا پھر کسی قاتل پانی میں غرقاب کرنے کے لیے۔

...... اور وہ پتھرائی رہی تھی...... شاید وہ اب تک پتھرائی ہوئی تھی۔ غم کے شدید ریلوں کے بعد اب اس کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جیسے سمجھ گئی تھی کہ یہ زندگی اسے ایسے ہی گزارنی ہے۔ شاہ زمان کی موت کے بعد وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ ایسی جوان بیوہ جس کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے کا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اگر وہ سوچتی بھی تو اسے اس حویلی کی اونچی دیواریں کون پار کرنے دیتا۔ یہاں کی رسمیں الگ تھیں۔ نہ طلاق کی صورت میں رہائی تھی، نہ بیوگی کی صورت میں...... بلکہ شاید مر کے بھی رہائی نہیں تھی کیونکہ یہ حویلی اتنی بڑی تھی کہ اس کا خاندانی قبرستان بھی اونچی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ دلاور زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ پہلے تو یہی کہا جاتا تھا کہ وہ اسی رات مارا گیا تھا...... لیکن پھر تین چار ماہ بعد کچھ اڑتی اڑتی سی باتیں سویرا کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ بچ گیا تھا اور حضور چانڈیو کے لوگ اسے اٹھا کر اپنی سبز حویلی میں لے گئے تھے مگر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ان باتوں کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بار یہ اڑتی اڑتی بھی سنی گئی تھی کہ وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ حضور چانڈیو نے اسے مڈل ایسٹ بھیج دیا ہے...... پھر ایک مرتبہ سویرا کو اپنی پروفیسر پھپھو کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے کراچی کی ایک سڑک پر دلاور کی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار تھا اور اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ بس یہ ساری باتیں اور مفروضے ہی تھے۔ غالب گمان اور تلخ حقیقت شاید یہی تھی کہ وہ نومبر کی اسی تاریک شب میں مار دیا گیا تھا۔ اس کا نام ان بہت سے لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو ان وڈیروں کی اونچی دیواروں والی حویلیوں میں جان ہارتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی پرچہ درج ہوتا ہے، نہ کوئی تفتیش ہوتی ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ان کی قبر بھی نہیں ہوتی......

وہ دلاور کو اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں، وہ اسے بھولتا نہیں تھا۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی ناتے سے وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ خون میں لتھڑا ہوا اور زخموں سے بھرا ہوا۔ وہ اس سے پوچھتا تھا۔ ''بی بی جی! کیا آپ بھی وہی سمجھتی تھیں، جو لوگ سمجھتے تھے؟ کیا آپ کا خیال بھی یہی ہے کہ میں نے منہ چھپا کر آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا؟''

وہ سسک اٹھتی۔ دل ہی دل میں کہتی۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں، میں سماج کی باندی ہوں۔ میں ایک گونگی بہری اندھی عورت ہوں۔''

وہ کہتا۔ ''لیکن آپ کا دل تو ہے بی بی جی، کیا آپ کے دل سے کوئی راہ میرے دل کی طرف نہیں آتی تھی؟''

وہ تڑپ اٹھتی، خیالی ہیولے سے مخاطب ہو کر کہتی۔

''ہاں آتی تھی ...... ہاں آتی تھی، وہ اب بھی ہے...... شاید ہمیشہ رہے گی۔ لیکن وہ راہ ہمیشہ سات پردوں میں چھپی رہتی ہے اور وہ چھپی ہی رہے گی۔''

وہ بے آواز رونے لگتی۔ ایسے میں دل کے نہاں خانوں میں جو خاموش سی ندی تھی، اس میں اچھال پیدا ہوتا اور اونچی پگڑیوں اور بلند دیواروں کے خوف سے اس کا سارا وجود لرز جاتا۔

شروع کے ایک دو برسوں میں شاہ فرمان نے کوشش کی تھی کہ اس حویلی کی پرانی رسموں کے مطابق اپنے بھائی کی بیوہ کو اپنے گھر میں ڈال لے لیکن جب اس نے دیکھا کہ بڑی آپا کی کوششوں کے باوجود سویرا سخت مزاحمت کر رہی ہے اور اس مزاحمت میں خودکشی کی حد تک جانے کو تیار ہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ مگر حویلی کی قید تو بہر حال موجود تھی...... ناک کٹی نگینہ بیگم کی طرح اس نے بھی اس قید کو آہستہ آہستہ قبول کر لیا تھا...... شاہ فرمان کی دوسری بیوی سے اس کا بیٹا شاہ بابر اب بالغ ہو چکا تھا اور شاہ فرمان اسے مستقبل میں مختار کل بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاہ بابر میں بھی اپنے باپ اور چچا کی ساری جاگیردارانہ خصوصیات موجود تھیں۔ آج کل وہ ایک سنگین چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ ساجے بٹھل اور چوڈیرو والوں کی دشمنی ہنوز موجود تھی۔ گاہے بگاہے کوئی کھڑاک ... بھی ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک کھڑاگ میں پچھلے سال ٹیپو ٹریگر گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ غضنفری ایک کیس میں چار سال کے لیے جیل چلا گیا تھا۔ بڑی آپا پہلے کی طرح حویلی میں دندناتی تھی اور شاہ فرمان کبھی کبھی رات کو شکار کے لیے نکلتا تھا لیکن یہ ''شکار'' جنگل میں نہیں حویلی کے اندر ہی ہوتا تھا اور اس کا نشانہ اکثر کوئی اچھی شکل والی ملازمہ یا بہاولپور وغیرہ سے آئی ہوئی طوائف بنتی تھی۔

وہ فروری کی ایک خنک شام تھی۔ سویرا کے کندھوں پر سفید شال تھی۔ وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ بڑی آپا جو پچھلے کئی دنوں سے کافی خوش تھی، روتی ہوئی سویرا کے پاس آئی اور بولی۔ ''سویرا! بہت برا ہوا ہے۔ حاجی اشرف نے راضی نامہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے دو ٹوک بات کر دی ہے۔ پرسوں والی پیشی پر وہ عدالت میں نہیں گئے...... تو...... تو بابر لٹک جائے گا، وہ نہیں بچے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے بڑی آپا کی آواز بیٹھ گئی اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

سویرا بے حد حیران تھی، کانپتی آواز میں بولی۔ ''لیکن...... لیکن وہ تو مان چکے تھے۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا......''

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ وہ بالکل لوہے کے چنے بن گئے ہیں۔ مجھو انہوں نے دھکے مار کر شاہ فرمان اور پیر فضل کو گھر سے نکال دیا ہے...... یہ سب کچھ اسی شاہ لاہوری کی طرف سے ہو رہا ہے۔ وہ خبیث ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ نہیں تو حاجی اشرف کے خاندان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ راضی نامہ نہ کرتے۔ یہ سب کچھ اسی کمینے کا کیا دھرا ہے۔ پہلے ہماری زمین پر نظر تھی، اب کنجر ہمارے پتر کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

بڑی آپا جس کو شاہ لاہوری کہہ رہی تھی، اس کا نام پچھلے سال ڈیڑھ سال سے ہی سننے میں آ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر لاہور میں ہی رہتا تھا مگر اس کے منیجر اور کارندے یہاں بڑا زبردست کام کر رہے تھے۔ انہوں نے چوڈیرو والوں کی زمینوں کے ساتھ ہی بہت سی زمین خریدی تھی اور وہاں ایک بڑی کاٹن جننگ فیکٹری لگائی تھی۔ فیکٹری کی تعمیر کے دوران میں شاہ فرمان کا فیکٹری مالکوں سے زبردست جھگڑا بھی ہوا تھا۔ وہی زمین کی حد بندی کے معاملے تھے کوئی اور ہوتا تو شاہ فرمان اور پیر فضل وغیرہ اسے کہاں ٹکنے دیتے مگر شاہ لاہوری ایک بہت بڑی پارٹی تھا اور لوگ صحیح کہتے ہیں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ شاہ لاہوری تو لاہور میں تھا، اس کے دست راست منیجر سلطان وانگلہ نے ہی چوڈیرو والوں کو تارے دکھا دیے تھے۔ بہر حال وہ معاملہ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر طے ہو گیا تھا۔ اب یہ بابر والا نیا کیس شروع ہو گیا تھا۔

بڑی آپا ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس نے سویرا سے کہا۔ ''مجھ سے تو حاجرہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ڈر لگ رہا ہے کہ اسے کچھ ہو ہی نہ جائے...... کلا کلا پتر ہے۔ اللہ خیر کرے۔ اسے کچھ ہو گیا تو وہ تو جیتے جی مر جائے گی۔''

سویرا نے کہا۔ ''اور بھائی فرمان کی بھی تو جان ہے بابر میں۔ جب سیشن کورٹ نے سزا بولی تھی بابر کو...... آپ کو پتا ہی ہے ان کی کیا حالت ہو گئی تھی۔''

''اب بھی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے، گولیوں کے پھکے مار رہے ہیں۔ کسی وڈے سرکاری افسر کو لے کر ایک بار پھر حاجی اشرف کی طرف جا رہے ہیں۔''

سویرا بولی۔ ''ہم عورتوں کو ان باتوں کا زیادہ پتا تو نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے لگتا ہے بڑی آپا کہ حاجی اشرف وغیرہ

سے بات کرنے کے بجائے اس شخص سے بات کی جائے جو اس مصیبت کی جڑ ہے۔ شاہ لاہوری یا پھر اس کے کسی بااختیار بندے سے رابطہ کیا جائے۔"

"میں نے کہا ہے پیر فضل سے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے، بلکہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ان بڑے لوگوں سے ملنا کون سا آسان کام ہوتا ہے۔"

بابر کی شکل سویرا کی نگاہوں میں گھومنے لگی...... کیا واقعی...... اسے پھانسی ہو جائے گی؟ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اٹھارہ سال اور شاید چند مہینے...... یا پھر انیس پورے ہو گئے ہوں گے۔ ابھی مسیں ہی بھیگی تھیں۔ اونچا قد، نمایاں طور پر اونچی ناک اور آنکھوں میں وہی تیز چمک جو چوڈیرو حویلی والوں کی خاصیت تھی۔ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کا نتیجہ نکلا تھا۔ بالغ ہوتے ہی اس کے مزاج میں کچھ عجیب تبدیلی ہوئی تھی..... اسے کھیتوں سے دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا تعلق لہلہاتی فصلوں سے نہیں، گاؤں کی خوش شکل لڑکیوں سے تھا مگر پھر جب بات اس کی اپنی بہن پر آئی تھی تو وہ ایک "باغیرت" بھائی بن گیا تھا اور سارے چولستان کی آگ اس کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کی بہن مہرین کا نام ایک لڑکے عاطف کے ساتھ آ گیا تھا۔ عاطف ساتھ والے گوٹھ کے ایک درمیانی درجے کے زمیندار حاجی اشرف کا بیٹا تھا اور زرعی کالج میں پڑھتا تھا۔ عاطف اور مہرین ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ لیکن ان وڈیروں کی تو اپنی ہی "معاشرت" ہوتی ہے۔ اپنے لیے کچھ اور اصول...... دوسروں کے لیے کچھ اور ضابطے۔ بابر نے کچھ ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لیا اور ایک دن منڈ بھیرو کے قریب عاطف پر ٹوٹ پڑا۔ عاطف کے ساتھ اس کا بڑا بھائی شاہد اور ایک دوست تھا۔ انہوں نے عاطف کو بچانے کی کوشش کی۔ اس لڑائی میں بابر کی سیون ایم ایم رائفل سے چلنے والی دو گولیوں نے عاطف کے بڑے بھائی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ عاطف کے بازو میں بھی گولی لگی۔ بابر گرفتار ہوا۔ ثبوت بڑے واضح اور ناقابلِ تردید تھے۔ سیشن کورٹ سے بابر کو پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد کے مراحل میں بھی برقرار رہی اور اب وہ پھانسی کی کوٹھری میں اپنے انجام سے دہشت زدہ، ایک زندہ لاش کی طرح موجود تھا۔ تین چار ماہ قبل، پہلی مرتبہ اس حوالے سے امید کی کچھ کرنیں پیدا ہوئی تھیں...... ایک مقامی سیاست دان کے توسط سے حاجی اشرف کے گھرانے سے بات آگے بڑھی تھی۔ خون بہا اور دیت کے قانون کے مطابق اگر وارث مجرم کو معاف کر دیتے تو بابر کی پھانسی ٹل سکتی تھی۔ یہ بات چیت مسلسل ڈیڑھ دو مہینے جاری رہی تھی۔ بالآخر چوڈیرو حویلی میں خوشی کے شادیانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ مدعی پارٹی نے کچھ شرائط کے ساتھ معافی نامے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی...... ان شرائط کے مطابق شاہ فرمان نے بیس مربعے زرعی اراضی حاجی اشرف کی فیملی کو دینا تھی۔ مقتول کی بیوہ کے لیے ایک کروڑ روپیہ نقد بھی طے ہوا تھا۔ ایک شرط یہ بھی طے کی گئی تھی کہ مقتول کے گوٹھ کو جانے والا قریبی راستہ جو شاہ فرمان کی زمینوں کی وجہ سے بند تھا، آمدورفت کے لیے کھول دیا جائے گا۔

...... یہ سارے معاملے تقریباً طے پا چکے تھے اور چوڈیرو حویلی میں ایک بار مٹھائی بھی تقسیم کی جا چکی تھی لیکن اب اچانک اطلاع آئی تھی کہ مدعی پارٹی نے مزید بات چیت سے انکار کر دیا ہے...... اور خون بہا لینے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ چوڈیرو حویلی میں تقریباً سب ہی جان گئے تھے کہ اس انتہائی تشویشناک تبدیلی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔

☆☆☆

منظر ایک سجے سجائے وسیع ڈرائنگ روم کا تھا۔ یہ ڈرائنگ روم جس کوٹھی کا تھا، وہ چوڈیرو حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہی کوئی سات کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ یہ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی اور شاہ لاہوری نے یہاں اپنے عارضی قیام کے لیے اپنی جننگ فیکٹری کے پہلو میں تعمیر کرائی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بے حد رقت آمیز منظر تھا۔ بابر کی ماں حاجرہ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، اپنی چادر پھیلا کر شاہ لاہوری کے دست راست سلطان دولہہ کی منتیں کر رہی تھی۔ شاہ فرمان اور پیر فضل بھی جو کچھ دیر پہلے تھوڑا ترش بولے تھے اب بھیگی بلی بنے کھڑے تھے۔ ان کی پگڑیوں کے اونچے شملے بھی جیسے ان کی طرح ہی مرجھائے ہوئے تھے۔ شاہ فرمان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دولہہ صاحب! اتنی گل کا تو ہم کو بھی پتا ہے کہ حاجی اشرف میں خود استادم نہیں ہے، وہ جو کچھ کر رہا ہے آپ لوگوں کی رائے اور مشورے سے کر رہا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، ہم اس لڑائی کو اور لمبا کرنا نہیں چاہتے۔"

"نہیں...... آپ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔" سلطان دولہہ نے اپنی رعب دار مونچھوں کو سہلایا اور اندازِ بے نیازی سے بولا۔

بڑی آپا جیسے تڑپ گئی۔ ایک دم آگے بڑھ کر بولی۔ "نہیں بھائی صاحب! ہم تو آپ لوگوں کے سامنے اپنی

جھولی پھیلانے آئے ہیں۔ بابر کو اللہ نہ کرے پھانسی ہوئی تو ایک نہیں دو موتیں ہوں گی۔ یہ کرماں سڑی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی قبر میں اتر جائے گی۔'' بڑی آپا نے بابر کی بیمار ماں حاجرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں بلند آواز میں رونے لگیں۔ سویرا بھی یہاں موجود تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں۔ وہ بھی دونوں جیٹھانیوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ پیر فضل نے انہیں بہ مشکل چپ کرایا اور سلطان واہلہ سے مخاطب ہو کر ملائمت سے بولا۔ ''واہلہ صاحب! حاجی اشرف نے جو تین شرطیں کہی تھیں وہ ہم نے پوری کی پوری مان لی تھیں۔ اب اگر وہ کوئی اور شرط رکھتے ہیں تو ہم اس پر بھی ابھی غور کرنے کو تیار ہیں۔ سنا ہے کہ وہ ایک دو اور شرطوں کی بات کر رہے ہیں......''

''یہ آپ لوگوں سے کس نے کہا ہے؟'' سلطان واہلہ درشت لہجے میں بولا۔ ''وہ تو سرے سے کوئی بات کرنے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اپنے جوان پتر کا لاشا دیکھا تھا، وہ آپ کے پتر کا بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''خدا دا واسطہ اے...... خدا رسول دا واسطہ اے۔ ایسی گل نہ کرو۔'' بابر کی ماں حاجرہ نے روتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ شاہ فرمان کا لشکارے مارتا ہوا رنگ بھی مٹی ہو رہا تھا۔

سلطان واہلہ نے سگریٹ سلگا کر اپنے بیش قیمت طلائی لائٹر کو جیب میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی نرمی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بولا۔ ''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ آپ ...... ایک دفعہ بڑے صاحب سے بھی بات کر کے دیکھ لیں۔ لیکن آج کل تو وہ بہت مصروف ہیں۔ اگلے ہفتے انہوں نے یہاں فیکٹری کے کام سے آنا ہے۔ میں ان سے آپ کے لیے ٹائم لینے کی کوشش کروں گا۔''

پیر فضل ہراساں لہجے میں بولا۔ ''پر تب تک تو بڑی دیر ہو جائے گی۔ وکیل پراچہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے، اتوار کے دن تک کر لو۔ ورنہ......'' شاید وہ آگے بھی کچھ کہتا مگر روتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

پیر فضل نے بڑی عاجزی سے سلطان واہلہ کو اشارہ کیا کہ وہ علیحدہ ہو کر اس کی بات سن لے۔ دونوں کوریڈور کی طرف چلے گئے۔ پانچ دس منٹ بعد دونوں کی واپسی ہوئی تو پیر فضل کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ لیکن دونوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جہاندیدہ اور تحمل مزاج پیر فضل کسی حد تک سلطان واہلہ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سلطان واہلہ نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں کہ بڑے صاحب (شاہ لاہوری) اتوار کے بجائے منگل یا بدھ کو یہاں کا چکر لگا لیں۔ زیادہ لوگوں کو لانے کی ضرورت نہیں۔ یہی جو پانچ لوگ یہاں ہیں، وہی آ جائیں...... اور ایک دفعہ بات کر کے دیکھ لیں۔ حاجی اشرف کی فیملی تو بالکل کوئی بات نہیں سن رہی لیکن میں کوشش کروں گا کہ حاجی اشرف کو کسی طرح یہاں بلا لوں۔ آگے آپ کی قسمت۔''

پھر وہ سویرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بہن جی! آپ بھی ضرور آئیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں آپ ہی پڑھی لکھی ہیں...... اور آسانی سے بات کر لیتی ہیں۔''

وہ سب کے سب اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ ان ابتلا کی گھڑیوں میں ان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چوڈیرو کی اسی اونچی حویلی کے مکین ہیں جو گردنوں کو خم کرنا نہیں جانتے، جن کو ہوا بھی چھو کر گزرنے سے ڈرتی ہے اور جن کی ایک دھاڑ سے بچ لوگوں کے کپڑے گیلے ہو جاتے ہیں۔ آج وہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ شخص کے پنجے میں تھے۔ ہاں...... اونٹ پہاڑ کے نیچے تھا۔

☆☆☆

بدھ تک کا دن ایک ایک پل گن کر کاٹا گیا تھا۔ چوڈیرو حویلی میں جہاں بس گھنگرو ہی چھن چھناتے تھے، ایک درجن حفاظ قرآن شب و روز تلاوت میں مصروف تھے۔ عیاشی کی دعوتوں کی جگہ لنگر جاری کیا گیا تھا۔ ترنڈا.. منڈ بھیرو اور نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اس لنگر پر آ رہے تھے اور ''کایا کلپ'' پر تبصرے کر رہے تھے۔ چوڈیرو حویلی والے اچھی طرح جان چکے تھے کہ اس خوفناک تالے کی اصل کنجی اس شاہ لاہوری کے پاس ہے۔ ورنہ حاجی اشرف اور اس کے خانوادے کی کیا حیثیت تھی۔ ان کو تو کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لیتا تھا چوڈیرو والوں نے۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑیاں آ گئیں، جب حویلی کی روتی سسکتی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ شاہ لاہوری کے سامنے پہنچیں۔ انہیں وسیع ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد اندرونی دروازہ کھلا۔ دراز قد شاہ لاہوری اپنے منیجر اور مسلح گارڈ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ کاٹن کی شاندار شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا...... چھوٹی چھوٹی نفیس ڈاڑھی اور فریم لیس عینک میں بڑا وجیہہ لگ رہا

تھا۔ سویرا نے دھیان سے اسے دیکھا اور اسے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کہیں وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ یا پھر...... اس کی نگاہ درست کام نہیں کر رہی تھی۔ اسے لگا کہ جو شخص رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سامنے اتالین صوفے پر بیٹھا ہے، وہ دلاور ہے۔ وہی دلاور جو چوڈیرہ حویلی کا ڈرائیور رہا تھا، گارڈ رہا تھا...... کارِ خاص رہا تھا اور پھر ایک گھناؤنے الزام کے ساتھ مار دیا گیا تھا۔

سویرا نقاب میں تھی لیکن اس کی آنکھیں اور پیشانی تو دکھائی دے ہی رہی تھی۔ اس نے چادر کھینچ کر اپنی پیشانی کو کچھ اور چھپایا...... لیکن اسے لگا کہ یہ چھپانا بے کار ہے...... وہ جو کوئی بھی تھا، اسے دیکھ چکا ہے اور پہچان چکا ہے۔

''جی کہیں۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ ٹھہری ہوئی بھاری آواز میں بولا۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔

کون تھا جو اس کی بات کا جواب دیتا۔ سب کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا۔

شاہ فرمان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تم...... تم...... آپ؟'' اس سے آگے اس کی زبان بند ہوگئی۔

سویرا نے دیکھا، پیر فضل اور بڑی آپا بھی تھرتھر کانپ رہے تھے۔ وہ رعب دار آواز میں بولا۔ ''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو اڑتی اڑتی سی باتیں آپ نے سنی تھیں کہ دلاور بچ گیا ہے...... دلاور حضور چانڈیو کے پاس ہے...... دلاور باہر ہے...... وہ غلط نہیں تھیں۔ میرا جرم تو بہت بڑا تھا اور مجھے واقعی مر بھی جانا چاہیے تھا لیکن...... بس اللہ کی مرضی تھی۔ اس تالاب میں سے نکلتے وقت میں بالکل مُردہ نہیں تھا، کوئی دو چار سانسیں باقی تھیں میرے اندر......''

یہاں کون تھا جو اس کی باتوں کا جواب دیتا...... یا اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ بھی سکتا۔ وہ سب لرزاں و ترساں کھڑے تھے یوں کہ کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں اگر کوئی کم لرزاں اور کم حیران تھا تو وہ سویرا تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔

...... وہ پھر اس کے سامنے آگیا تھا۔ وہ کیوں اس کے سامنے آگیا تھا؟ ہزاروں سال پہلے جب اس روہی کے گرد قدیم بستیاں تھیں، وہ شاید ان بستیوں میں بھی نظر آتا تھا۔ بار بار اس کے سامنے آجاتا تھا...... دور رہ کر بھی اس کے آس پاس ہی ہوتا تھا......

تم کب تک مجھ کو بھولو گے

اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے
صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ ان دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ اَن دیکھے سے سائے ہیں، جو ساتھ مرے ہی چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں، اک گرم دوپہر کی مستی میں
اک خام خیال سی مستی میں
کچھ ان چھوئے سے جذبے ہیں، جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

وہ اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔ اردگرد سے بے خبر ہوکر سب سے جدا ہوگئی تھی۔ کمرے میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ حاجرہ اور بڑی آپا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور تو اور...... شاہ فرمان کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ وہ دلاور سے پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا مگر سارے لفظ عاجزی کے تھے...... شکست کے تھے اور منت کے تھے۔ شاہ فرمان کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سویرا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ٹوٹے ٹوٹے سے فقرے تھے...... ''اللہ نے تجھے بڑی اچی شان دے دی ہے دلاور۔ ہم سے پرانے بدلے نہ لے۔ جو ہوگیا ہم نے اس پر مٹی ڈال دی، تم بھی ہمیں معاف کردو۔ جرم تھا تو بھی کردو، نہیں تھا تو بھی کردو۔''

پیر فضل بھی اسی طرح کے جملے بول رہا تھا۔ کچھ جملے سویرا کی سمجھ میں آرہے تھے، کچھ نہیں آرہے تھے۔ پھر اچانک بڑی آپا بری طرح چلّا اٹھیں۔ بابر کی ماں حاجرہ، شاہ لاہوری کے پاؤں پکڑنے آگے بڑھی تھی اور وہیں پر بے ہوش ہوگئی تھی۔

☆☆☆

بابر کی والدہ کو آدھ گھنٹے بعد ہوش آگیا۔ پیر فضل وغیرہ اسے بہاولپور اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن وہ دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بچے کے لیے معافی نامہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔ اگر جان جاتی ہے تو چلی جائے۔

...... آخر فیصلہ کن مرحلہ پہنچ گیا۔ شاہ لاہوری یعنی دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تین شرطیں ایسی ہیں جن کو مانے بغیر یہ مسئلہ کسی صورت بھی حل نہیں ہوسکتا......''

بابر کے لواحقین تناؤ اور دکھ کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ حاجرہ بیگم نے یہاں تک کہہ دیا۔ ''وے میرے پترا!

مجھے تیری شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ تو بس میرے بابر کی گردن سے پھانسی کا پھندا نکلوا دے۔'' وہ بلک رہی تھی۔

دلاور نے کہا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ شرطیں سن لیں۔ ویسے یہ کوئی ایسی شرطیں نہیں ہیں جو آپ نہ مان سکیں اور ایک شرط تو بالکل معمولی ہے۔''

''تم بتاؤ دلاور! ہم سن رہے ہیں۔'' پیر فضل بے قراری سے بولا۔

''جو زرعی زمین آپ لوگ ہرجانے میں دے رہے ہیں، وہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہے۔ وہ کم از کم چالیس مربعے ہونی چاہیے۔ پچاس پچاس مربعے زمین تو آپ کے گھر کے ایک ایک بچے کے پاس ہے۔''

یہ شرط فوری طور پر مان لی گئی۔

اس کے بعد دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دوسری شرط یہ ہے کہ...... حاجی اشرف کا بیٹا عاطف اور آپ کی بیٹی مہرین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی کوئی بے جوڑ رشتہ نہیں ہے۔ آپ لوگ ان دونوں کے راستے کی دیوار نہ بنیں، ان کی شادی کر دیں۔''

شاہ فرمان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے...... لیکن کچھ بھی تھا شیر لوہے کے جال میں تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ روہی کا سرکش وڈیرا مکافات کے شکنجے میں تھا۔ سب خاموش تھے...... اور یہ خاموشی بوجھل ہو رہی تھی۔ بڑی آپا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات پہلے بھی ہمارے کانوں میں پڑ چکی ہے دلاور...... اور ہم اس بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اب تم نے بھی یہ بات کہہ دی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام بھی ہو جائے گا۔ بس ہم حویلی میں تھوڑا سا مشورہ کر لیں۔''

''مشورہ کس سے کرنا ہے آپ نے؟'' دلاور چیخ کر بولا۔ ''مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ سارے ''مشورے والے'' اسی جگہ یہاں موجود ہیں۔ جو کچھ ہو جانا ہے، اب یہیں پر ہو جانا ہے یا پھر نہیں ہونا۔''

دلاور کو برہم دیکھ کر ایک بار پھر چوڈیرو حویلی کے سرخیلوں کے رنگ اڑ گئے۔ حاجرہ بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ شاہ فرمان، پیر فضل اور بڑی آپا وغیرہ نے تھوڑی دیر تک سر جوڑ کر باتیں کیں۔ اس دوران میں ڈرائنگ روم کے اندر عجیب سنسنی خیز ماحول رہا۔ آخر شاہ فرمان نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔ ''جس میں بچے خوش ہیں، ہم بھی اس میں خوش ہیں۔ ہمیں یہ شرط منظور ہے۔''

سویرا ایک طرف بیٹھی مبہوت، سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

اب سب کو تیسری شرط کا انتظار تھا۔ دل دھڑک رہے تھے۔ دلاور نے کہا۔ ''تیسری شرط بھی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہے لیکن یہ میرے لیے بہت بڑی ہے۔'' اس نے چند لمحے رک کر بڑی آپا کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ ''میں ایک بھوکا ننگا غریب تھا اور بھوکے ننگے غریبوں کے لیے عزت سے قیمتی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس یہی ان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ آپ کو اچھی طرح پتا ہے، چار سال پہلے آپ کی اُچی حویلی میں مجھ سے یہ سرمایہ چھینا گیا۔ مجھ پر چوری کا الزام لگا اور اس سے بھی بڑا الزام یہ لگا کہ میں نے...... اپنی مالکن کو بے عزت کرنے کی کوشش کی۔ وہ مالکن جس کو میں آنکھ بھر کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا......'' دلاور کی آواز بوجھل ہو گئی۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ سب سکتہ زدہ تھے۔ دلاور نے شاہ فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بات کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ شاہ فرمان! تمہیں ابھی سب کے سامنے اس رات کی اصل حقیقت بتانا ہوگی۔ یہی تیسری شرط ہے۔''

شاہ فرمان کی صورت دیدنی تھی۔

...... اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہی کچھ ہوا جو دلاور چاہتا تھا۔ اپنے اندر کی ساری تڑپ پھڑک کے باوجود شاہ فرمان کو یہ تیسری شرط بھی ماننا پڑی۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار اپنی کسی غلطی کو تسلیم کیا ہوگا...... سویرا آنسوؤں میں ڈوبی یہ سب کچھ سنتی رہی۔ شاہ فرمان نے اعتراف کیا کہ وہ نیپو ٹریگر اور دو تین قریبی کارندوں کی باتوں میں آ گیا تھا۔ نشے کی حالت میں اس سے ایک غلط فیصلہ ہو گیا۔ وہ گول مول بات کر رہا تھا مگر دلاور کے کاٹ دار نہایت تیکھے سوالات کے جواب میں شاہ فرمان کو بتانا پڑا کہ دلاور کو سویرا کی نظر سے گرانے اور حویلی سے نکالنے کے لیے اسے یہ منصوبہ بنانا پڑا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس رات چہرہ چھپا کر لاکھوں کے گہنے چوری کرنے والا اور سویرا پر حملہ کرنے والا نیپو ٹریگر تھا......

شاہ فرمان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

سویرا نقاب کے اوپر سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہی تھی...... تم کون ہو...... تم کہاں سے آئے ہو...... ہزاروں سال پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ شاید اسی روہی کے کنارے...... شاید انہی ریتیلے کھنڈروں کے آس پاس...... میرے دل کی اتھاہ گہرائی میں جو ایک بے نام ندی بہتی

ہے، اس کا پانی تمہیں جانتا ہے۔ میں نہیں جانتی لیکن وہ تمہیں جانتا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے تم ہمیشہ سے ایسے ہی بے خوف ہو۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن میں جو کچھ ہوا، بڑی تیز رفتاری سے ہوا۔ بلکہ حیران کن تیز رفتاری سے ہوا۔ نہ صرف زرعی زمین کے سلسلے میں ضروری کاغذات تیار ہوگئے بلکہ چند افراد کی موجودگی میں عاطف اور مہرین کا نکاح بھی ہوگیا۔ طے ہوا کہ رخصتی چند ہفتے بعد اچھے طریقے سے کی جائے گی۔ بابر کے ڈیتھ وارنٹ تک جاری ہو چکے تھے۔ مقتول کے لواحقین نے عدالت میں پیش ہوکر معافی نامہ اور دیگر ضروری دستاویزات پیش کردیں۔

شاہ فرمان کے اکلوتے بیٹے کے گلے سے پھانسی کا پھندا نکل گیا۔ مگر وہ فالج کے سبب خود بستر پر جا پڑا۔ شاید اپنی گردن جھکانے اور شرطیں ماننے کا صدمہ بھی اسے اسی طرح ہوا تھا جس طرح بیٹے کی پھانسی کا ہوتا۔ اسپتال میں ہی اسے فالج کا دوسرا شدید اٹیک بھی ہوگیا...... اور وہ کچھ بھی نگلنے کے قابل نہ رہا۔ ایک پہلو شروع میں ہی بے جان ہوگیا تھا۔

دلاور ابھی اپنی فیکٹری والی کوٹھی میں ہی تھا۔ ایک روز وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیکریٹری منشا ریاض اندر داخل ہوا بولا۔ ”جناب! ایک خاتون آپ سے ملنے پر اصرار کررہی ہے۔ واہلہ صاحب نے اسے لان میں بٹھایا ہے۔“

”کون ہے؟“ دلاور نے اخبار دیکھتے ہوئے کہا۔

”کسی بڑے اخبار کی رپورٹر ہے۔ کہتی ہے کہ اس کے پاس آپ کے لیے کچھ مفید اطلاعات ہیں اور وہ آپ کو براہِ راست دینا چاہتی ہے۔“

دلاور کے چہرے پر پہلے تو بیزاری کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتا ہوا لان کی طرف بڑھ گیا۔

سرسبز لان پر سرما کی نرم سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ دیدہ زیب سفید میز کے گرد فائبر کی سفید کرسیاں دھری تھیں۔ ایک کرسی پر ایک برقع پوش خاتون بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ ہاتھ میں فائل تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ رسمی کلمات کے بعد دلاور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے محترمہ۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں تم سنو گے یا نہیں۔“

دلاور نے چونک کر دیکھا۔ برقعے کے نقاب میں سے بس آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا لیکن اگر اس سے بھی کئی گنا کم نظر آرہا ہوتا تو وہ پہچان لیتا اور اس آواز کو بھی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ سویرا تھی۔

وہ سکتہ زدہ سا اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ بولی۔ ”دلاور! اس طرح دیکھو گے تو کسی کو شک ہوجائے گا۔ کوئی بات کرو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے فائل اپنے سامنے میز پر پھیلالی۔

وہ اپنی لرزش کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ امید تو تھی کہ آپ سے ملاقات ہوگی لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ اس طرح ہوگی۔“

”میں تم سے ملنا چاہتی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔“ وہ بوجھل آواز میں بولی۔ ”کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہوگا مجھ سے بات کرنے کے لیے؟“

دلاور کا دل بھر آیا۔ بے ساختہ بولا۔ ”سویرا بی بی! آپ کہیں تو ساری زندگی اسی طرح بیٹھ کر آپ کی بات سن سکتا ہوں۔“

وہ کبھی سویرا بی بی کہنے پر ناراض ہوجایا کرتی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، بس نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔ ”دلاور...... سب سے پہلے تو...... تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے...... تم نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مجھے...... ایک ایک بات یاد ہے...... میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں۔“ اس کا گلا رندھ گیا۔

”آ...... آپ شرمندہ کررہی ہیں۔ آپ تو مالکن ہیں۔ میری وجہ سے رسوائی ہوئی آپ کی...... دکھ ملا آپ کو ...... معافی تو مجھے مانگنی ہے۔“

سرسبز گراسی لان کے اوپر سرما کا سورج تھا۔ روہی کی طرف سے آنے والی ہوا دھوپ کو مزید خوشگوار کررہی تھی۔ وہ دونوں جیسے اردگرد کی ہر چیز، ہر منظر سے کٹ گئے تھے۔ بس ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے اور ایک دوسرے کو سن رہے تھے۔ دل کے پھپھولے پھوٹنا شروع ہوئے تو پھوٹتے چلے گئے۔ ایک موقع پر سویرا نے اشک بار آواز میں کہا۔ ”میں اس بات پر خود کو کبھی معاف نہیں کرپاؤں گی کہ وہ لوگ تمہیں میرے سامنے بے دردی سے مار رہے تھے اور میں تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرپارہی تھی۔ پچھلے چار سالوں میں وہ بات شاید ایک پل کے لیے

بھی میرے ذہن سے نہیں نکلی دلاور......''

دلاور نے کہا۔ ''میرے ان سارے زخموں پر، آپ کی بس یہ ایک بات ہی مرہم رکھ رہی ہے کہ آپ کو بھی مجھ پر لگنے والے الزام کا یقین نہیں ہوا......''

گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی۔ لمحے پَر لگا کر اڑ رہے تھے۔ ایک ملازم دو دفعہ چائے رکھ کر جاچکا تھا اور اب دلاور اسے تیسری مرتبہ طلب کرنے والا تھا۔ سویرا کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ اب جاننا چاہ رہی تھی کہ اس رات کے لہولہان آغاز کے بعد دلاور پر کیا بیتی۔ وہ کہاں کہاں سے ہوتا ہوا ''لاہوری انٹرپرائزر'' کی شاندار منزل تک پہنچا اور اس کے دیگر حالات کیا ہیں؟

دلاور تو ہمیشہ سے سویرا کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ جن کی ذات سے عشق ہوتا ہے، ان سے کچھ بھی چھپایا نہیں جاتا۔ شاید چھپایا جا ہی نہیں سکتا۔ دلاور نے ڈھیرے ڈھیرے سب کچھ سویرا کے گوش گزار کردیا۔ وہ حیرت میں غلطاں سنتی رہی۔ کئی من وزنی آہنی ایکسل کے ساتھ دلاور کا پانی سے نکلنا، حضور چانڈیو کی سبز حویلی میں پہنچنا، زخموں کا علاج کرانا، پھر حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر کے ساتھ بحری سفر...... بحری سفر میں پیش آنے والا وہ سنسنی خیز واقعہ جب بے شمار مالیت کا جیولری باکس سمندری پانی میں گرا۔ دلاور کا باکس کو ڈھونڈ لینا لیکن پھر اسے وہیں پر چھپا رہنے دینا...... دلاور نے سب کچھ سویرا کو کہہ سنایا۔

وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا اور بول رہا تھا...... ''میرے اندر کچھ بدل چکا تھا سویرا بی بی......! ان اُچی حویلی والوں نے مجھے اندر سے تبدیل کردیا تھا۔ ورنہ میں نے تو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں حضور چانڈیو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ دبئی پہنچ گیا۔ وہاں میں اور مکرانی رشید دو مہینے سے زیادہ نہیں رکے۔ رشید نے ایک زخمی عربی کو خون دیا تھا۔ ان لوگوں نے بخشش کے طور پر اسے کوئی پندرہ ہزار ریال دیے۔ کچھ ریال ہم نے ویسے کمائے تھے۔ یہ ساری رقم لے کر ہم دبئی سے واپس ''برکا'' پہنچے۔ مکرانی رشید بحری جہاز کا لوڈر رہا تھا اور کئی ملاحوں سے اس کی واقفیت تھی۔ میں نے اسے جیولری باکس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کرکے ایک لانچ کا بندوبست کیا...... اور ایک نقشے کا انتظام بھی کرلیا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ایک روز کے پُرخطر سفر کے بعد ہم کھلے سمندر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پرندے کی چونچ جیسا بڑا پتھر سمندر میں سے نکلا ہوا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناکہ اس جگہ کو ''برڈ سائٹ'' کہتے ہیں۔ غوطہ خوری کا کچھ سامان بھی ہماری لانچ پر موجود تھا مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ تیسرے غوطے میں ہی میں پتھروں میں پھنسے ہوئے اس جیولری باکس تک پہنچ گیا......

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کافی کچھ سمجھ گئی ہوں گی۔ مجھے اس منزل تک پہنچانے میں اس جیولری باکس نے بہت مدد کی ہے۔ میں نے بن باقر فیملی کے کچھ خاندانی زیورات کو چھوڑ کر باقی جیولری مسقط، دوہا اور کراچی میں مختلف جگہوں پر فروخت کی۔ میرے پاس ایک کافی بڑی رقم آگئی۔ میں اس رقم کو کہیں لگانا چاہتا تھا۔ آخر میں نے اسے ایک محفوظ کاروبار میں انویسٹ کردیا۔''

''کون سا کاروبار؟'' سویرا نے پوچھا۔

''مجھے معلوم تھا آپ یہ سوال کریں گی۔'' دلاور نے کہا اور کچھ کھوسا گیا۔ چائے کی دو چسکیاں لے کر بولا۔ ''شاید آپ کو عجیب لگے گا کہ میں نے آسان کاروبار چھوڑ کر ایک مشکل میدان کیوں منتخب کیا...... سویرا بی بی! میں نے دبئی میں ''سی ڈائیونگ'' کا ایک بڑا ٹریننگ سینٹر خریدا اور اس کو مزید وسیع کردیا۔ یہ امارات میں غوطہ خوری کے چند بڑے تربیتی مراکز میں سے ایک ہے۔''

''میں...... واقعی حیران ہورہی ہوں۔'' وہ بھی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

دلاور نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ روہی کی ہوا نے بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھیر دیں۔ اس نے کہا۔ ''سویرا بی بی! مجھے اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں پانی ہی کا بیٹا ہوں۔ جس ٹوبے سرفو دم گھٹ کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، اس نے مجھے دریائے راوی کے پانیوں سے ہی تو نکالا تھا اور اپنی بانجھ بیوی کی گود میں ڈالا تھا۔ وہی جس کا آدھا سر سفید تھا اور آدھے بال مہندی رنگے تھے۔ وہ میری سگی ماں نہیں تھی لیکن اس نے سگی ماؤں کی طرح ہی میری پرورش کی تھی۔ چاچا سرفو لاہور کا بلکہ شاید پورے پنجاب کا نامور ٹوبا تھا۔ اپنی جوانی میں اس نے بڑے یادگار کام کیے تھے۔ بڑھاپے میں اس نے اپنا فن مجھے سونپ دیا۔ اس نے مجھے گہرے پانیوں کی مچھلی بنا دیا۔ لیکن یہاں میرے فن کی قدر کرنے والا کون تھا۔ میں باہر کے کسی ملک میں ہوتا تو شاید مجھے گولڈ میڈل ملتے...... مجھ پر ڈالروں کی بارش ہوتی لیکن یہاں مجھے ناقدری اور غربت کی بارش نے کچے لون (نمک) کی طرح کھوردیا۔ ایک بار میں

ملازمت کے لیے ایک محکمے میں گیا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ ایک بار تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لینا چاہا لیکن ناکام ہوا...... پرائیویٹ ایف اے کرنے والے کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ آخر در بدر ہوگیا۔ پیٹ پالنے کے لیے چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے لگا۔ بڑی آپا اور شاہ فرمان جیسے سخت مزاج لوگوں کا چاکر ہوگیا۔ شاید یہی وجہ تھی...... کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنے ''غوطے'' کی پوری قیمت وصول کی۔ برڈ سائٹ پر اس طوفانی شام میں وہ ''غوطہ'' صرف میں لگا سکتا تھا اور میں نے لگا لیا......''

وہ چند سیکنڈ چپ رہ کر بولا۔ ''سوری سویرا بی بی! بات دوسری طرف نکل گئی۔ میں بتا رہا تھا کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے بھی میرا ناتا پانی سے ہی تھا۔ اس لیے جب میرے پاس سرمایہ آیا تو میں نے اسے اس فن میں لگایا جو میرے اپنے اندر موجود تھا۔ میں نے ''سی ڈائیونگ کی ٹریننگ'' کے کام کو چمکایا اور وہ ایسا چمکا کہ مجھے نہال کر گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مجھے اتنی جلدی اتنی بڑی کامیابیاں ملیں گی۔ اب خلیج میں میرے آٹھ بڑے ٹریننگ سینٹر ہیں۔ ایک سینٹر کراچی میں تیار کروا رہا ہوں جس کا سارا چارج کمرانی رشید کے پاس ہے۔ وہ ایک بہترین دوست اور پارٹنر ثابت ہوا ہے۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے میں دبئی میں شیخ بن باقر سے ملا تھا۔ میں نے پہلے اس سے معافی مانگی پھر اس کا سارا پیسا، منافع سمیت اسے واپس کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اسے مزید خوشی اس بات کی تھی کہ اسے اس کے باقی خاندانی زیورات بھی جوں کے توں واپس مل گئے تھے۔ آج کل...... میں کچھ اور چھوٹے موٹے کام بھی کر رہا ہوں۔ جیسے آپ کے گوٹھ کے پاس یہ فیکٹری......''

سویرا اور دلاور کی گفتگو کو بریک لگ گئے، تازہ چائے آ گئی تھی۔ سویرا نے ابھی تک صرف ایک کپ پیا تھا۔ دلاور کے اصرار پر اس نے دوسرے کپ پر آمادگی ظاہر کی۔ دلاور نے خود چائے بنائی...... اور کپ اس کی طرف بڑھایا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ...... کہ کہیں وہ اپنی انگلیوں سے اس کی انگلیوں کو نہ چھو لے۔ وہ نقاب کو ذرا... سرکا کر چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ ناگاہ دلاور کی نگاہ اس کے ہونٹوں پر پڑی۔ وہ جیسے سرتا پا جھنجھنا اٹھا۔ وہ اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ ان حسین گداز ہونٹوں سے اس کا ایک پرانا ناتا تھا۔ ایسا ناتا جس سے ''ہونٹوں والی'' بھی بے خبر تھی۔ دلاور کو لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی آ گئی ہے۔

موبائل فون کے سگنلز نے دلاور کی مشکل آسان کی۔ یہ فون سویرا کے شولڈر بیگ میں گنگنایا تھا۔ اس نے اسکرین دیکھی لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ اب مضطرب نظر آنے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے حویلی سے نکلے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب اسے جانا ہوگا۔

دلاور نے کہا۔ ''کیا آپ دوبارہ آ سکیں گی؟''

''پتا...... نہیں۔'' وہ تذبذب سے بولی۔

''آپ نے تو مجھ سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ ایک دو باتیں میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔'' دلاور کے لہجے میں درخواست تھی۔

اس نے ایک بار دلاور کی آنکھوں میں دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ''اچھا...... دو تین دن میں کوشش کروں گی......''

پھر وہ عجلت میں چلی گئی۔ وہ دو تین دن کا کہہ رہی تھی، وہ دو تین زندگیاں انتظار کر سکتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کورے کار کو خود ڈرائیو کر کے آئی تھی، اسی پر واپس روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

چوڈیرو والی کوٹھی کے عقبی لان میں دلاور نے ایک چھوٹا سا خوبصورت تالاب بنوا رکھا تھا۔ نیلے ٹائلوں والا۔ اس میں اترنے کے لیے چمکیلے اسٹیل کی سیڑھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے پانی کے اوپر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پانی کی جانی پہچانی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ وہ ایک بے مثال غوطہ خور تھا۔ اس نے عشق کے پانیوں میں بھی ایک طویل...... بہت طویل غوطہ لگایا تھا مگر گوہرِ مقصود آج بھی اس سے اتنا ہی دور تھا، جتنا بہت برس پہلے تھا...... شاید ہزاروں برس پہلے تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ سیکریٹری منشا نے آ کر اطلاع دی کہ اس دن والی میڈم آئی ہیں۔ دلاور کے سینے میں جلترنگ سا بج اٹھا۔ وہ پل پل اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد دلاور اور سویرا سنہری دھوپ والے ہرے بھرے لان میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ملازم چائے اور لوازمات لے آیا تھا۔

''آج میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دلاور! تم کیا کہنا چاہتے تھے؟'' سویرا نے آدھے نقاب کی اوٹ سے پوچھا۔ آواز میں کسی بے نام دکھ کی لہر تھی۔

دلاور بات کو کسی دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو سوچا ہوتا ہے۔ دلاور کے منہ سے بھی بے ساختہ جو بات نکلی،

وہ کچھ اور تھی اس نے دفعتاً کہا۔ ''سویرا! میں اپنی حیثیت جانتا ہوں اور آپ کا مرتبہ بھی...... ہم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن کیا...... کسی طرح، ایسا ہو سکتا ہے کہ...... یہ زمین اور آسمان...... مل سکیں؟''

ایک چھناکا سا ہوا۔ جیسے ہزار ہا قمقموں والا کوئی فانوس دھماکے سے فرش پر گرے اور چکنا چور ہو جائے۔ وہ سکتہ زدہ نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ دلاور بھی پتھرایا ہوا تھا۔ اس کے لیے کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ گردش جب دوبارہ بحال ہوگی تو کس ڈھنگ سے ہوگی؟ سویرا کا ردعمل کیا ہوگا؟ خاموشی طویل اور بوجھل ہوتی چلی گئی۔ دلاور کے ضبط کے تار تناؤ کے سبب ٹوٹنے لگے۔ آخر وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا دلاور؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے...... ہم...... مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ تم سے...... کوئی ایسی بات سنوں گی۔''

نہ جانے اتنا حوصلہ دلاور کے اندر کہاں سے آ گیا تھا۔ شاید یہ حوصلہ اسے اس کی انوکھی اور سچی محبت نے دیا تھا جو برسوں بڑی خاموشی سے اس کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی۔ وہ بولا ''سویرا! اگر آپ نہ چاہیں تو کچھ نہیں ہو سکتا...... اور اگر آپ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہر رکاوٹ گر سکتی ہے، ہر دیوار رستہ دے سکتی ہے۔ سب کچھ آپ پر ہے۔ صرف آپ پر۔''

وہ گم صم تھی، بس اس کی خوبصورت آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کا اور دکھ کا مدوجذر تھا۔

وہ بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ خوف ہماری خوشیوں کو کھا جاتا ہے سویرا...... اور عورت کا خوف تو اس کی پوری زندگی برباد کر دیتا ہے۔ اس خوف سے نکل آنا ہی، اصل میں جینا ہے۔ آپ کی بہت سی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ چوڈیرو حویلی کی وڈیرا شاہی دم توڑ رہی ہے۔ وڈا چودھری ایک زندہ لاش کی طرح اسپتال میں پڑا ہے۔ آپ کے پنکھ ہیں، آپ اڑ سکتی ہیں...... اگر آپ اڑنا چاہیں......'' اس نے سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے حد اعتماد سے کہا۔ ان لمحوں میں وہ صرف دلاور نہیں تھا...... دلاور شاہ لاہوری تھا۔

سویرا نے نہایت بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی صورت نہیں۔ تم جانتے نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم ایسی بات کہو گے۔ یہ تو آگ میں چھلانگ لگانے والی باتیں ہیں۔ ہم...... میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا تھا......''

''آپ غلط کہہ رہی ہیں...... آپ غلط کہہ رہی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر زور دے کر بولا۔ اس کا سارا وجود اندرونی اضطراب سے لرزنے لگا تھا۔

سویرا نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں، وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو بری طرح مروڑ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انداز مستحکم تھا۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے...... جانا چاہیے......''

روہی کی ہوا کراہ اٹھی۔ دھوپ کا رنگ ہلدی جیسا ہو گیا۔ اونچے پیڑوں نے اور چھوٹے قد کے دکھوں نے دکھ سے اپنے سر جھکا لیے۔ دلاور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی واسکٹ میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہی ایک خط میں نے پرسوں پہلے آپ کو دینے کے لیے لکھا تھا۔ وہ آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کی جگہ یہ خط دے رہا ہوں۔ میری آخری درخواست ہے کہ اس خط کو ایک بار پڑھ ضرور لیجیے گا۔''

سویرا نے خط نہیں تھاما تو دلاور نے اسے اس کے شولڈر بیگ کی بیرونی پاکٹ میں ڈال دیا۔ ''خدا حافظ!'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''خدا حافظ!'' دلاور نے خود کو بمشکل سنبھال کر کہا۔

وہ مین گیٹ کی طرف چل دی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے ...

☆☆☆

روہی کے اوپر گہرے تاریک آسمان پر تاروں کے جھرمٹ تھے۔ کیکروں، ٹاہلیوں اور بیریوں سے گزر کر آنے والی ہوا، دلاور کے بالوں کو اس کی پیشانی پر لہرا رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی کی چھت پر نواڑ کی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ ابھی ابھی سلطان واہلہ نے اسے اطلاع پہنچائی تھی کہ شاہ فرمان اسپتال سے لاعلاج ہو کر حویلی آ گیا ہے۔ اب اس نے جتنی دیر بھی جینا تھا، شاید بستر پر ہی جینا تھا۔ بڑی آپا نے حویلی کی باگ ڈور اپنے کمزور ہاتھوں میں لے لی تھی۔ بابر ابھی جیل میں تھا۔ ویسے بھی ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ باپ کی پگڑی سر پر رکھ سکتا۔ باقی اولاد اس سے بھی چھوٹی تھی۔

پرسوں جو خط دلاور نے سویرا کو دیا تھا، اس کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا۔ یہ خط اس نے پرسوں اس وقت جلدی

جلدی گھسیٹا تھا جب ایک فون سننے کے بہانے وہ سویرا کے پاس سے اٹھ کر اندر گیا تھا۔ وہ خط کچھ اس طرح تھا۔

"سویرا! میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جو کچھ ہے بس آخری بار ہے۔ ہفتے کی شام جل گوٹھ میں سائیں رحیم کے بیٹے کا ولیمہ ہے۔ آپ کے گھر سے بھی لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ بھی جا رہی ہوں گی۔ آپ کو یاد ہوگا جب کئی برس پہلے آپ نے مجھے تحفے میں گھڑی دی تھی تو میں نے بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ہمت دکھائی تھی اور آپ کو گلابی پھولوں والی ایک کشمیری شال کا تحفہ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ وہ اوڑھیں گی مگر میں نے وہ کبھی آپ کے جسم پر نہ دیکھی۔ اگر آپ نے میری جسارتوں کو نظرانداز کر کے، میری التجا کے بارے میں کچھ سوچا ہے...... اور اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ہے تو پلیز ...... مجھے بے خبر نہ رکھیں۔ میں نے اس شال کا ذکر بھی اسی حوالے سے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ ہاں سویرا...... ہفتے کی شام میری زندگی کے لیے بہت اہم ہوگی...... بہت ہی اہم۔ میں جانتا ہوں وہ شال اب بھی آپ کے پاس موجود ہے...... اگر آپ وہ شال اوڑھ کر آئیں گی تو میں اپنی قسمت پر ناز کروں گا...... روئے زمین پر مجھ جیسا خوش قسمت اور کوئی نہ ہوگا اور اگر آپ نہیں اوڑھیں گی تو...... میں سمجھ جاؤں گا کہ مجھے اب کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھانی۔ میں ہمیشہ کے لیے پاکستان سے نکل جاؤں گا لیکن سویرا! اس میں بھی آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ ہاں سویرا! مجھے...... اپنی مری ہوئی ماں کی قسم ہے، میں کوئی گلہ نہیں رکھوں گا۔ آپ نے محبت کی جو دولت مجھے دے رکھی ہے، وہ ملاپ یا جدائی کی مرہونِ منت نہیں...... اور نہ کبھی ہوگی۔

خدا حافظ!"

خط کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا، اس کے ذہن میں پیوست تھا۔ اس کے جدید سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس کے لیے دبئی سے اس کے ایک منیجر کی کال تھی۔ وہ کوئی پاکستانی ہی تھا بولا۔ "سر! سنگاپور سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چیف انسٹرکٹر سے ملنا ہے۔ وہ "سی ڈائیونگ" کے حوالے سے ایک بڑا شو کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس میں چند منٹ کی پرفارمنس دیں۔ چار پانچ منٹ کی لائیو پرفارمنس کے لیے وہ ایک لاکھ ڈالرز کی آفر کر رہے ہیں۔"

"کب ہے شو؟"

"اتوار کی دوپہر۔"

"ریجیکٹ کر دو۔ میں اتوار کے روز یہاں سے نکل سکتا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رحیم سائیں کے گاؤں کا نام جل گوٹھ تھا۔ رحیم سائیں نے بیٹے کی شادی تو عام سے انداز میں کی تھی مگر ولیمے میں ساری کسر نکال دی تھی۔ گوٹھ سے باہر دور تک قناتیں اور خیمے لگے ہوئے تھے۔ جنریٹرز کی مدھم گھوں گھوں میں ہر طرف بجلی کے لشکارے تھے۔ ڈھول تاشے، ناچ گانا، آتش بازی، غرضیکہ خوشی کا ہر رنگ یہاں موجود تھا۔ ڈیڑھ ہزار مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صوبائی وزیر، ایم این اے، سابق ایم این اے، ایم پی اے، اعلیٰ سرکاری افسران، نامی گرامی وڈیرے، ہر طرح کے لوگ یہاں موجود تھے۔ دلاور شاہ لاہوری، ان لوگوں میں سے تھا جنہیں یہاں خاص الخاص مہمانوں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اردگرد کیمرے بار بار چکارے مار رہے تھے۔ رنگ و روشنی کی اس برسات میں دلاور کی نگاہیں کسی کا انتظار کر رہی تھیں...... دھڑکنیں زیر و زبر تھیں۔ پل پل ایک پہاڑ تھا۔ بالآخر چوڈیرو حویلی کی دو پجارو گاڑیاں نظر آئیں۔ دلاور ہر طرف سے کٹ کر ان گاڑیوں کو دیکھنے لگا...... مجسم نگاہ بن گیا۔ سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ گاڑیوں میں سے چوڈیرو حویلی کے لوگ اترنے لگے۔ پہلے زرق برق لباس میں بڑی آپا اتریں پھر حاجرہ بیگم، پھر نگینہ بیگم اور دیگر عورتیں...... ایک ایک کر کے سب اتر گئے۔ گاڑیاں خالی ہو گئیں۔ دلاور کا دل ڈوب گیا۔ ہر طرف تاریکی چنگھاڑنے لگی۔ تو کیا وہ آئی ہی نہیں؟ اس نے خود کو حویلی کی اونچی دیواروں میں حنوط کر لیا ہے...... وہ دیوانہ سا ہو کر مہمانوں کے درمیان سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خیموں سے آگے نکل گیا۔ اسے پتا چلا کہ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ چوڈیرو حویلی سے شاید ایک یا دو گاڑیاں مزید آنا تھیں۔

اس کی دھڑکنیں زیر و زبر تھیں۔ سانسیں الجھ رہی تھیں۔ وہ ریتیلے ٹیلوں میں تھوڑا آگے نکل گیا۔ چند قدم کی دوری پر وہی تالاب تھا جہاں دلاور نے سویرا کو پہلی بار دیکھا تھا...... مرحوم شاہ زمان اور سویرا، جیپ سمیت بارش تالاب میں گر گئے تھے...... یہیں پر...... ہاں یہیں پر وہ یادگار واقعہ ہوا تھا جس نے دلاور کے جسم و جاں میں لازوال عشق کا بیج بویا تھا۔ پاکیزہ...... بے غرض...... اور فاصلے کا عشق...... اجنبی سناٹوں کی طرح خاموش...... یکسر خاموش۔ یہی وہ پیڑ تھے جن کے نیچے اس نے نیم بے ہوش سویرا کو لٹایا تھا...... اور...... اس کے نایاب ہونٹوں کو چھوا تھا۔ یہیں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی...... اور شاید آج

اسے ..... یہیں پر ختم ہونا تھا۔

روہی کا ذرہ ذرہ منتظر تھا۔ بابا فرید کی آواز جیسے نشیب وفراز میں گونج رہی تھی ...... یہ عشق آسان نہیں۔ مٹی نہ... پھرول فریدا ...... یار گواچے نئیں لبھدے (لیکن اس کا یار تو ابھی گم نہیں ہوا تھا)

اور پھر اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ چوڈیرو حویلی کی ایک اور ٹویوٹا جیپ عظیم الشان خیموں کی ''مین انٹرنس'' کے سامنے آن رکی تھی۔ کائنات کی گردش تھم گئی اور اسی کائنات میں اس کا دل بھی تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ان لوگوں کو دیکھتا جارہا تھا جو جیپ سے اتر رہے تھے ...... پھر ایک چودھرانی کے عقب میں اسے سویرا نظر آئی۔ دلاور کی جان لبوں پر آ گئی۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا کہ وہ بھسم ہو گیا ہے اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ ہلکے نسواری اور کریم لباس والی سویرا نے ایک پتلی سی سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ وہی سفید شال جو بیوگی اور اندوہ کی علامت ہوا کرتی ہے ...... دلاور کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ وہ جیسے بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ دوبارہ جیپ کی طرف دیکھا۔ سویرا ادھ کھلے دروازے کے عقب میں تھی۔ اس نے سفید چادر اتار کر جیپ میں رکھی ...... اندر سے، نفاست سے تہ کی ہوئی گلابی پھولوں والی کشمیری چادر نکالی۔ عجیب دلنشین انداز میں سر جھکائے ہوئے اس نے یہ شال اوڑھ لی۔ اسے کندھوں پر درست کیا اور دیگر عورتوں کے ساتھ شامیانوں کی طرف بڑھنے لگی۔

تھمی ہوئی کائنات دوبارہ گردش میں آ گئی۔ روہی کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ دلاور کا دل دوبارہ متحرک ہو گیا۔ آسمان پر کروڑہا ستاروں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خوف کے پتھر پر قطرہ قطرہ گرنے والی محبت نے اس میں سوراخ ہی نہیں کیا تھا، اسے چکنا چور بھی کر دیا تھا۔ دلاور نیم تاریکی میں کھڑا مسلسل سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بے کل چاہ تھی اس دیکھنے میں۔ کسی درویش کے بول دلاور کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔

تیرے عشق دے وچ معشوق ناہو، نئیں اج تک غلط نگاہ کیتی
تیری ہر ملاقات میں اج کیتی جیویں موسیٰ نال خدا کیتی
اک تینوں رب نئیں کہہ سکدا باقی ساری رسم ادا کیتی

اے میرے محبوب! میں نے آج تک تجھے غلط نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے ساتھ میری جو بھی ملاقات تھی وہ ایسی ہی تھی جیسی موسیٰ اور خدا کے درمیان ہوتی تھی (اپنے شوق اور جذب کا بیان کیا کرو) میں بس تمہیں خدا ہی نہ کہہ سکا ورنہ دل میں تیرا رتبہ خدا کے قریب قریب ہی رہا ہے......

''سویرا......!'' دلاور نے دل ہی دل میں کہا اور شامیانوں کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

منظر اسی کوٹھی کے ڈرائنگ روم کا تھا جہاں آج کل دلاور قیام پذیر تھا۔ دلاور کے سامنے سویرا کی پھپھو پروفیسر عالیہ بیٹھی تھیں۔ عینک اور تین چوتھائی سفید بالوں والی انتہائی سمجھدار اور زیرک خاتون وہ مسلسل رو رہی تھیں اور بار بار اپنے سفید رومال سے آنسو پونچھتی تھیں۔ یہ یقیناً خوشی کے آنسو تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''دلاور! خدا گواہ ہے، مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ یہ سب ہو چکا ہے...... مجھے لگتا ہے کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ سویرا تم سے شادی پر رضامند ہو چکی ہے۔ اس کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا ہے اپنے پنجرے سے نکلنے کا...... اپنے جال کو توڑنے کا۔ لیکن وہ اب بھی بہت ڈری ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے ایک دو باتیں کہی ہیں جو میں تم تک پہنچانا چاہتی ہوں بیٹا۔'' وہ عجب محبت بھری عاجز آواز میں بولیں۔

''آپ حکم کریں پھپھو! میں سویرا کو اپنانے کے لیے ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ ہر حد تک جا سکتا ہوں۔''

پھپھو عالیہ، دلاور کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔ ''وہ شرطیں منوانے والی نہیں ہے دلاور! وہ تو...... وہ تو تمہاری محبت میں سر سے پیر تک ڈوبی ہوئی ہے۔ میں پھر کہوں گی، مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ میں یہ سب کچھ اپنے ہوش و حواس میں دیکھ رہی ہوں...... میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، دل کی پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر تم اس سے یہ کہو کہ یہ جو کچھ ہے یہ سب تمہارا نہیں ہے کسی اور کا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ چل کر کسی جھونپڑا بستی میں رہنا شروع کر دے تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گی۔ ایسی تبدیلیاں دو چار مہینوں یا برسوں میں نہیں آتیں دلاور۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان ...... بہت پہلے سے ...... کچھ موجود تھا۔ تم دونوں کے دلوں کی گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔''

وہ خاموش رہا مگر اس کے دل سے آواز آرہی تھی ...... شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ہزاروں سال پہلے جب روہی میں بستیاں تھیں ...... چمکیلی گرم دوپہروں میں نیم عریاں جسموں والے جفاکش لوگوں کے سائے یہاں حرکت کرتے تھے، اس وقت بھی ہماری روحیں یہاں بھٹکتی تھیں۔

وہ پھر موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''سویرا کیا کہتی ہیں پھپو؟''

''وہ کہتی ہے بیٹا! جو کچھ بھی ہونا ہے یہ جلد ہو، اس میں جتنی دیر ہوگی، اتنا ہی غلط ہوگا۔ دوسری بات وہ یہ کہتی تھی کہ شادی بہت سادگی سے ہو اور بہاولپور میں ہو۔ اس کے والدین تو بس نام کے ہیں' پچھلے کچھ عرصے سے تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کی شرکت کا ذکر تو بے معنی ہے...... تیسری بات اس کے دماغ میں یہ بیٹھی ہوئی ہے کہ شادی کے بعد تمہیں اور اسے زیادہ دیر یہاں پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی بس ایک ہی شرط ہے...... اور وہ یہ کہ شادی کے بعد چند دن کے اندر وہ تمہارے ساتھ پاکستان سے چلے جانا چاہتی ہے...... اور یہ بھی چاہتی ہے کہ تم یہاں اپنے کاروبار کو وائنڈاپ کردو یا کسی دوسرے کے حوالے کردو مکمل طور پر...... کم از کم اگلے دس سال کے لیے۔''

دلاور چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پھپو! سویرا کو جن لوگوں کا خوف ہے، ان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ان کی طرف سے ہونے والی ہلکی سی ہلکی مزاحمت کا بھی میں انہیں منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں لیکن سویرا کا کہا ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں ان کی ان ساری باتوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اور عین اس کے مطابق چلوں گا۔''

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کی مجازی تکمیل کے لیے وہ کہاں تک جاسکتا ہے۔ اگر سویرا اس سے کہتی کہ وہ انہی کپڑوں میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دے۔ دنیا کی آخری حد پر بسی ہوئی کسی بستی میں جابسے اور کبھی ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھے تو اسے یہ بھی دل و جان سے قبول تھا۔

...... چوڈیرو حویلی کی اونچی دیواریں اب سویرا کو روک نہیں سکی تھیں۔ شاہ فرمان تو زندہ لاش کی صورت بستر پر تھا۔ فیملی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ باہمی بٹوارے شروع ہوگئے تھے۔ دلاور کے کہنے پر مقامی ایم این اے نے خود جاکر ''بڑی آپا'' سے بات کی تھی اور اس نے معمولی پس و پیش کے بعد سویرا کو آزادی کا پروانہ جاری کردیا تھا۔ حویلی کے اصولوں کے مطابق اسے کئی مربعے اراضی سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس نے خوشی سے یہ جائداد حویلی والوں کی جھولی میں پھینک دی تھی۔ پیش کیے گئے کاغذات پر دستخط کردیے تھے۔

...... اور یہ محبت کی تکمیل کی رات تھی۔ بہاولپور کی ایک کوٹھی میں سادگی سے سجائے گئے ایک حجلۂ عروسی کا منظر تھا۔ ایک چاند دلاور کے ہاتھوں میں تھا اور وہ ان گھڑیوں میں روئے زمین کا سب سے خوش قسمت شخص تھا۔ اس کے اردگرد ایک طلسماتی گلابی دھند تھی۔ اس نے اپنی پیشانی چاند کی پیشانی سے ٹکائی...... وہ ان سرخ ہونٹوں کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو صرف اس کے اور ان ہونٹوں کے درمیان تھا......

وہ ہولے سے بولا۔ ''سویرا! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

''نہیں دلاور!'' اس نے پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔ پھر توقف سے بولی۔ ''دلاور! تمہاری محبت نے میرے خوف کو چکنا چور کردیا ہے لیکن اس کی کرچیاں اب بھی میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے یہاں سے دور لے جاؤ۔''

''آپ نے جو کہہ دیا...... وہ ہوگیا۔'' وہ ڈوب کر بولا۔

وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ہولے سے بولی۔ ''اب مجھے آپ نہ کہو دلاور۔''

''زندگی کی آخری سانس تک کہوں گا۔ آپ کے لیے کوئی اور لفظ میری زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنی پیشانی سویرا کے ان ہاتھوں پر ٹیک دی جو اس کے گھٹنوں پر دھرے تھے۔

یہ محبت تھی...... پرستش تھی...... مجازی عشق کی معراج تھی...... یا اس سے بھی آگے کی کوئی چیز......

اگلے چند روز دلاور اور سویرا کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ ان شب و روز کی کیفیت کو وہ شاید دونوں ہی لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے تھے۔ بہاولپور کی یہ کوٹھی ان دونوں کے لیے ہر طرح سے محفوظ تھی۔ اونچی چاردیواری، خاردار تاریں، سیکورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز۔ پھپو عالیہ بھی ان دونوں کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔ ایک روز وہ دونوں بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور پرواز کرگئے۔ دلاور نے سویرا کی ایک دیرینہ خواہش پوری کی۔ اسے اندرونِ لاہور کے وہ گلی کوچے دکھائے جہاں وہ کھیلا کودا اور پروان چڑھا تھا۔ انہی تنگ گلیوں میں وہ بوسیدہ مکان بھی تھا جہاں کبھی سرفو دم گھٹ رہتا تھا۔ جو اس کا چاچا بھی تھا، باپ بھی اور استاد بھی......

دلاور ان گلیوں میں اپنی یادیں تازہ کرتا رہا اور ماضی کے دھندلکوں میں گھومتا رہا۔ وہ ایک خطیر رقم کا چیک بھی اس بستی کی حالت سدھارنے کے لیے لایا تھا۔ ذمے دار لوگوں کو یہ چیک سپرد کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ جیسے ایک قدیم بوجھ اس کے کندھوں سے اتر گیا۔ وہ دونوں شاہراہ قائداعظم کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور

السلام علیکم

ہمیں اپنے نئے بلاگ (ویب سائیٹ) کے لئے رائٹرز کی
ضرورت ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی ممبر ناول، افسانہ،
ناولٹ لکھنا چاہے تو ہم سے کانٹیکٹ کر سکتے ہیں۔ اپنی تحریر
اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی
کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتہ کے
اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ہمیں
ای۔میل کریں یا ان بکس میں میسج کریں۔

شکریہ

Email Address:- aatish2kx@gmail.com

پورے تین روز لاہور کی سیاحت کرتے رہے۔ شاہ لاہوری اور اس کی دلہن بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور کی سڑکوں پر تھے لیکن سڑکوں پر کہاں تھے، وہ تو جیسے فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ دن میں کئی بار دلاور اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا تھا، کیا زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے؟ اتنے دلکش دن؟ ... اتنی طلسماتی راتیں؟ کسی وقت سویرا ایک دم چپ سی ہو جاتی تھی۔ وہ اس چپ کی وجہ سمجھتا تھا۔ سویرا کو ایک بات کا قلق تھا جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا...... چار برس پہلے وہ اس وقت بے عملی اور تذبذب کی کیفیت میں کیوں رہی جب چوہدری حویلی میں اسے اس کے سامنے زخموں سے چُور کر کے موت کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ وہ ان لمحوں میں اس کے لیے کھڑی کیوں نہ ہو سکی...... کبھی کبھی اس کے اچانک چپ ہو جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اب جلد از جلد پاکستان سے پرواز کر جائیں۔ بہاولپور جا کر سویرا نے پھر یہی بات کہی تو دلاور بولا۔ ''سویرا! آپ کے اور پھپھو کے کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ مجھے صرف تین روز کی مہلت اور دے دیں۔''

''وہ کس لیے دلاور؟'' وہ ذرا اداسی سے اس کے ہاتھ پر اپنا سر رکھ کر بولی۔

''جمعے کے دن میرا ایک بہت پرانا سپنا پورا ہونے والا ہے۔ کراچی کے ''سی ڈائیونگ سینٹر'' کا افتتاح۔ میں یہ افتتاح خود کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے اس سینٹر کا نام کیا ہے؟''

وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس کا نام ہے سرفراز سی ڈائیونگ ٹریننگ سینٹر۔ سرفراز...... جسے لوگ سرفو دم گھٹ کے نام سے جانتے ہیں اور میں جس کے تصور کو کبھی اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر مسکرا کر چپ ہو گئی۔

وہ دونوں بیش قیمت صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا سر دلاور کے شانے سے ٹکا دیا۔ ذرا کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''دلاور! کسی وقت بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے؟'' وہ اس کی نسواری زلفوں کو اس کے کانوں کے پیچھے اڑس کر بولا۔

''پتا نہیں کس سے۔''

''ان لوگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ اب میری اور آپ کی ہوا کو بھی چھو سکیں۔''

''لیکن دلاور! میری نانی کہا کرتی تھیں، روہی رنگ رنگیلی ہے...... اور زہریلی بھی۔ اور جب یہ اپنے زہریلے روپ میں ہوتی ہے تو ناگن بن جاتی ہے اور اس کے بہت سے منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس منہ سے ڈس لے، کسی کو پتا نہیں ہوتا۔''

''آپ...... کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ چوہدری والے نہ سہی، کوئی اور ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

کراچی کے ساحل پر عظیم الشان ٹریننگ سینٹر کا افتتاح کرنے کے بعد دلاور نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب اس کی سوچوں کا رخ خلیج عمان کی ایک الگ تھلگ اور پُرسکون جگہ ''برکا'' کی طرف تھا۔ یہاں سمندر کے قریب ایک درمیانے سائز کے لیکن نہایت خوبصورت بنگلے کو اس نے اپنی مستقل رہائش کے لیے منتخب کیا تھا...... اس کے حکم پر اس کے اماراتی منیجر نے اسے دنیا کی ہر سہولت سے آراستہ کر دیا تھا...... وہ فی الحقیقت ایک جنت نشاں جگہ بن گئی تھی۔ اس سے بہتر رہائشی آئیڈیا دلاور کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ صرف بیس دن کے مختصر وقت میں اس نے اس جگہ کو اپنی سویرا کے شایانِ شان بنا ڈالا تھا۔

وہ بہاولپور والی کوٹھی میں دلاور کی آخری شام تھی، ٹکٹ کنفرم تھے۔ پھپھو عالیہ، ڈرائیور اور دو گارڈز کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں...... سویرا ملازمہ کی مدد سے پیکنگ میں مصروف تھی۔ دلاور حسبِ عادت رات کے کھانے سے پہلے سوئمنگ پول میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہنے کا ہنر جانتی ہے۔ ریلیکسیشن کے لیے وہ سانس باہر نکال کر پانی کی تہ میں چلا جاتا تھا اور دس پندرہ منٹ کے لیے آنکھیں موند لیتا تھا۔ باہر کی آوازیں ناقابلِ فہم سرسراہٹ کی طرح اس کی سماعت تک پہنچتی تھیں۔ اسے لگا کہ سویرا اسے پکار رہی ہے۔ اسے دن میں کئی مرتبہ اس طرح کا دھوکا ہوتا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جو ملاپ سے کم نہیں ہو رہی تھی، بڑھ رہی تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ عارضی اضافہ نہیں ہے۔

اچانک اسے دوبارہ آواز کا شک ہوا۔ اسے پتا چلا کہ اس مرتبہ دھوکا نہیں، وہ تیر کی طرح پانی کی سطح پر آیا۔ اس نے ایک قیامت خیز منظر دیکھا۔ سفید شلوار قمیص والا ایک کرخت چہرہ لڑکا چلّا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دو دھاری خنجر تھا۔ سویرا اس کے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے دلاور کی طرف آنے سے روک رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ لڑکے کی عمر بمشکل چودہ پندرہ سال رہی ہوگی مگر اس کا تن و توش اچھا تھا۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''دلاور...... دلاور۔'' سویرا کے پہلو میں اس کی

سفید پھولوں والی قمیص پر خون کا ایک بڑا داغ دکھائی دے رہا تھا۔ یکا یک بجلی سی چمکی۔ لڑکے نے دلاور کو پانی سے نکلتے دیکھا تو جھلا کر پلٹا اور سویرا کی کمر اور گردن پر خنجر کے پے در پے تین وار کیے۔ تب تک دلاور کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ دیوانہ وار حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا۔ سویرا نے ابھی تک حملہ آور کے قدم نہیں چھوڑے تھے۔ دلاور اوپر اور حملہ آور نیچے تھا۔ اس نے اتنی وحشت سے حملہ آور کی کلائی مروڑی کہ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی دوران میں گارڈز اور دو ملازم لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ چکے تھے۔ وہ حملہ آور سے لپٹ گئے۔ وہ چنگھاڑنے لگا۔ ''شاہ پرویز نام ہے میرا...... شاہ فرمان کا پتر ہوں۔ ہم اپنی دشمنی بھولتے نہیں ہیں۔ قبر تک پیچھا کرتے ہیں...... قبر تک کرتے ہیں......''

چوڑے چکلے جسم کا وہ نوعمر لڑکا کسی پکی عمر کے مرد کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔ دلاور، سویرا کی طرف لپکا۔ اس کا سارا لباس خون سے تربتر تھا۔ اردگرد کی ہر چیز...... اور اس کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اس نے خونچکاں سویرا کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''سویرا......'' وہ دیوانوں کی طرح پکارا۔ ''گاڑی نکالو...... جلدی کرو۔'' اس کی آواز کوٹھی کے در و دیوار میں گونجتی چلی گئی...... اس کے گارڈز نے حملہ آور کو پوری طرح چھاپ رکھا تھا۔

چند منٹ بعد ٹویوٹا کی جیپ برق رفتاری سے اسپتال کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سویرا کا خونچکاں چہرہ دلاور کی گود میں تھا۔ سویرا نے اپنا مہندی لگا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ست رنگی چوڑیاں اس کی کلائی میں چھنک اٹھیں۔ وہ دلاور کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''دلاور...... جب چوڈیرو حویلی میں آپ کو بے دردی سے مارا جا رہا تھا...... میں کچھ نہ کر سکی تھی...... دیکھتی رہ گئی تھی...... آج...... شاید میں نے...... کچھ نہ کچھ تو...... کفارہ ادا کر دیا ہے...... کر دیا ہے نا؟''

دلاور نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ اسی طرح اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے دوبارہ بولی۔ ''ہم نے دیر کر دی دلاور! ہم نے دیر کر دی نا...... آپ سے کہا تھا نا...... یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں...... خود کچھ نہ کر پائے...... تو کسی اور طریقے سے کریں گے...... ان کے...... بہت سے منہ ہیں دلاور......'' اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی۔ گاڑی کے پہیے بہاولپور کی سڑکوں پر چرچرا رہے تھے۔

دلاور نے ڈرائیور کو گاڑی اور تیز چلانے کا حکم دیا۔ پھر وہ سویرا کی پیشانی چوم کر بولا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو بچنا ہے...... آپ کو زندہ رہنا ہے...... میری خاطر...... میری خاطر سویرا...... نہیں تو میں بھی نہیں رہوں گا۔''

اس نے لمبے لمبے سانس لیے۔ جیسے چاہتی ہو کہ اس کی سانسوں کی ڈور ٹوٹنے نہ پائے۔ اپنی روح کو اپنے جسم سے منسلک رکھنے کی کوشش کر رہی ہو...... وہ جیسے پوری جان کے ساتھ دلاور سے لپٹ گئی مگر موت کا فرشتہ زیادہ زورآور ہوتا ہے...... وہ اپنا کام کر گزرا...... وہ اسپتال کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے مر گئی......

اوکھے پینڈے لمبیاں راہواں عشق دیاں...... درد جگر سخت سزاواں عشق دیاں......

☆☆☆

منظر بہاولپور شہر کے ایک قبرستان کا تھا۔ اس قبرستان میں سویرا ابدی نیند سو رہی تھی۔ وہی سویرا جو عشق کے ایک انجانے بندھن کی اسیر تھی...... معروف رومانی کردار صاحباں کی طرح اس نے بھی اپنے مرزا سے کہا تھا کہ وہ دیر نہ کرے، وہ یہاں سے نکل جائے، وہ جلدی کرے۔ لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ یہاں بھی ہو کر رہی تھی۔

سویرا کو اس قبرستان کا مکیں ہوئے اب دو ماہ گزر چکے تھے۔ روزانہ شام سے پہلے اس کی قبر پر آنا دلاور کا معمول تھا۔ دلاور کی شیو بڑھ کر اب چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سر کے بال لمبے ہو چکے تھے۔ ایک عجیب صوفیانہ رنگ سا چڑھتا جا رہا تھا اس پر...... لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بزنس اور اپنے معمولات سے بالکل علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ کراچی میں اپنے ٹریننگ سینٹر اور چوڈیرو میں جننگ فیکٹری کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے یہیں بہاولپور شہر میں ایک مناسب گھر خرید لیا تھا۔

وہ قبر کے قریب گم صم کھڑا تھا جب کسی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، یہ اس کا عزیز ترین دوست اور بزنس پارٹنر رشید تھا، رشید کھرانی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ واقعی ایک جواں سال بزنس مین نظر آتا تھا۔

''تم یہاں؟'' دلاور نے پوچھا۔

رشید نے کہا۔ ''دلاور بھائی! اپن کا وکیل پورے سندھ میں نمبر ایک ہے۔ اس لونڈے کی عمر کم ہے۔ پھانسی کی سزا تو نہیں ہوگی، مگر تیرہ چودہ سال سے پہلے باہر آ گیا تو قسم ہے...... نام بدل دینا۔''

وہ جس کو لونڈا کہہ رہا تھا ...... یہ وہی نہایت غصیلا "چودھری زادہ" تھا جو دو ماہ پہلے دلاور کو قتل کرنے کی نیت سے اس کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اسے تو قتل نہ کرسکا مگر اس کا دو دھاری خنجر سویرا اور ایک گارڈ کی جان لے گیا۔ واردات کے وقت اس تنومند لڑکے نے چلا چلا کر کہا تھا......

میرا نام شاہ پرویز ہے۔ میں شاہ فرمان کا پتر ہوں......

وہ شاہ فرمان کا بیٹا نہیں بھانجا تھا...... اس کی بہن کا بیٹا۔ حویلی کی زہریلی فضا نے اس کے کچے ذہن میں زہر بھرا تھا۔ غرور، نفرت اور کینے سے بھری ہوئی وہ حویلی اپنے مکینوں کو اور مکینوں کے بچوں کو اور دے بھی کیا سکتی تھی۔

شاید سویرا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ رنگ رنگیلی ریتیلی روہی جب زہریلی ناگن کا روپ دھارتی ہے تو اس کے کئی منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس طرف سے اور کس منہ سے ڈس لے گی، کچھ پتا نہیں ہوتا۔

رشید آنکھوں میں نمی لے کر عجیب نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے سامنے ایک کاغذ کرتے ہوئے بولا۔ "دلاور بھائی! یہ آپ کا ٹکٹ ہے۔ آپ نے ایمن سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ ٹائم گزر جائے ...... پھر آپ سوچیں گے۔ ایمن کا خیال ہے کہ اب وہ ٹائم آگیا ہے۔ وڈی وہاں دبئی میں آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کو جانا چاہیے۔"

دلاور نے ٹکٹ کا پرنٹ رشید کے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر پھاڑ کر پھینک دیا۔ "تم اپنے نام کا ٹکٹ بنواؤ رشید۔"

"آپ ...... کیا کہہ رہے ہو بھائی؟" رشید سخت حیرت میں تھا۔

"میری جگہ تم وہاں جاؤ گے رشید ...... تمہاری جگہ میں یہاں رہوں گا...... وہ دیکھو...... وہ وہاں سو رہی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں؟ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔"

رشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پچھلے چار پانچ برسوں میں وہ اس کا مزاج شناس ہو چکا تھا۔ وہ دلاور کے اس لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سمجھ گیا کہ اس نے جو کچھ کہہ دیا ہے، وہ حتمی ہے۔ دونوں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ سورج جنڈ، کیکر اور بیری کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ شہر خموشاں پر اس کی آخری کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ رشید نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "یہ بات اپنے مغز میں آگئی ہے کہ اب آپ یہاں سے نہیں جائیں گے لیکن آپ ایمن کو بس ایک بات بتا دیں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کا یہاں رہنا کتنا خطرناک ہے۔ بہاولپور اور چوڑیروں میں کوئی بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہ آگ جو آپ کے اردگرد سلگ رہی ہے اور ان گوٹھوں میں ہر جگہ جس کی چنگاریاں ہیں، آپ کو کسی بھی ٹائم نقصان پہنچا سکتی ہیں۔"

دلاور کی نگاہ چند میٹر دور سویرا کی قبر پر تھی۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "اب میرے پاس گنوانے کو کچھ نہیں ہے رشید! میں اب یہیں رہوں گا۔ انہی شاہ فرمانوں، شاہ پرویزوں اور سانپ بچھوؤں کے درمیان۔" اس نے عجب پُرعزم لہجے میں کہا ...... اور جیکٹ کے نیچے اپنے بھرے ہوئے کولٹ پسٹل کو چھوا۔

کچھ دیر بعد جب رشید کراچی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو دلاور دبے دبے کرب کے ساتھ بولا۔ "وہاں جاکر ایک کام کرنا ہے رشید ...... برکا کے اس بنگلے کو ختم کر دینا جہاں جاکر ہم نے رہنا تھا۔"

"آپ ...... کا مطلب ہے فروخت کردوں؟"

"نہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "اسے ختم کر دینا ہے۔ بالکل مسمار ...... میں اگر کبھی وہاں جاؤں تو مجھے اس کی ایک اینٹ بھی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

رشید نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ وہ روڈ کے ساتھ اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر چلا گیا تو دلاور بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ سویرا کی قبر پر گرے ہوئے خشک پتوں اور گھاس وغیرہ کو ہٹایا، اس پر تھوڑا سا پانی چھڑکا۔ گلاب کی چند پتیاں اس پر بکھیریں اور گم صم سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ روہی کی تھوڑی سرد تھوڑی رنگیلی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ اس ہوا میں بیتے دنوں کی خوشبو تھی اور پھر وہ چند پُرمسرت دن جو کئی صدیوں پر بھاری تھے اور آخر میں وہ جانکاہ صدمہ۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "آپ ہمیشہ مجھ سے پوچھتی رہی ہیں۔ شاید صدیوں سے پوچھتی رہی ہیں ...... تم کب تک مجھ کو بھولو گے؟ ...... آج میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں بھول سکتا ہی نہیں۔ یہ میرے بس میں ہے ہی نہیں۔

"دنیا میں ایسا ہوتا تو نہیں ہے لیکن آپ دیکھ لینا ...... جب تک میری سانس ہے، میں آپ کو یہاں اپنے آس پاس ہی نظر آؤں گا ...... ہاں سویرا! جب تک سانس ہے اور جب سانس نہیں رہے گی ...... تو پھر ...... تو پھر آپ کو پکاروں گا، آپ کو تلاش کروں گا۔"